پیش لفظ

زیر نظر کتاب حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کے دعوتی، علمی اور تربیتی خطوط کا مجموعہ ہے، اس سے پہلے اس موضوع پر ان کی دو کتابیں ''صدائے محبت'' اور ''پیام محبت'' کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔

''صدائے محبت'' پاکستان وہندستان کی ممتاز علمی شخصیتوں سے دور جدید میں اسلام کو درپیش چیلنج، اس سے عہد برآ ہونے کی صورت اور عصر حاضر کی دینی تحریکات اور مفکروں کی فکر میں موجود کمزوریوں کے اجزاء کی نشاندہی اور سلف صالحین کے اسلامی فکر کے بنیادی اہداف کے ساتھ جدیدیت کے چیلنج کے فہم اور اس سے مقابلہ کے لئے کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

''پیام محبت'' کتاب سندھ کے دانشوروں کے نام خطوط پر مشتمل ہے، جس میں جی ایم سید، شیخ ایاز، محمد ابراہیم جویو وغیرہ کو درد دل سے اسلام کی دعوت دی گئی ہے اور مسلمان دانشوروں کو صحیح خطوط پر کام کرنے پر اکسایا گیا ہے۔

''ندائے محبت'' بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اس کتاب میں شامل بیشتر خطوط دفتر میں فائلوں سے لئے گئے ہیں۔ فائلوں میں خطوط کی فوٹو کاپیاں موجود تھیں، البتہ بہت سارے خطوط ایسے بھی تھے، جن کی فوٹو کاپیاں محفوظ نہیں تھی، ہم محترم عبدالکریم گاندھی صاحب کے مشکور ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر حافظ صاحب کے اپنے نام لکھے گئے خطوط کی کاپیاں ارسال فرمائیں۔

زیر نظر کتاب میں شامل کچھ خطوط تو دعوتی حکمت عملی کے موضوع پر ہیں کچھ خطوط، علمی نوعیت کے ہیں اور کتاب میں شامل آخری خطوط خالص تربیتی نوعیت کے ہیں، جو راہ سلوک کے طالبوں کو ان کی طلب اور بے تابی کو دیکھکر لکھے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ہم سب کے لئے نافع بنائے۔ (آمین)

اشفاق احمد بھٹو

حیدرآباد

ندائے محبت

حافظ محمد موسیٰ بھٹو کے علمی ودعوتی خطوط کا مجموعہ

زیر نظر مضمون حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کے خطوط پر مشتمل کتاب ''ندائے محبت'' سے ماخوذ ہے، یہ کتاب ترتیب اور کمپوزنگ کے مراحل میں ہے۔ اس سے پہلے حافظ صاحب کے خطوط کے دو مجموعے ''صدائے محبت'' اور ''پیام محبت'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں بعض خطوط علمی، دعوتی اور حکمت عملی کے موضوع پر ہیں تو بعض خطوط خالص تربیتی نوعیت کے ہیں، خطوط میں سب سے اہم پہلو جو غالب ہے، جو جھلکتا ہوا نظر آتا ہے، وہ اس کا محبت آمیز اسلوب ہے۔ (مرتب)

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، علم وفضل کی صاحب شخصیت ہیں۔ دور جدید کے حالات ومسائل کا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ دارالعلوم کورنگی کو عالم اسلام کی سب سے بڑی جامعہ بنانے کے ان کے کردار کو دیکھکر، ان کی غیرمعمولی تنظیمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے، دارالعلوم کورنگی کی سب سے بڑی خصوصیت جو ملک کے دوسرے مدارس کے لئے قابل تقلید ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے نکلنے والے علماء کرام، گروہی ودائراتی خولوں سے بلند ہوکر، ملت اور امت کے مفاد کو مقدم رکھتے ہیں اور وہ ذہنی اعتبار سے وسعت فکر کے حامل ہوتے ہیں اور ملت کے سارے دینی گروہوں سے حسن ظن رکھتے ہیں۔ البتہ اگر دارالعلوم میں دور جدید کے علمی، فکری اور ہمہ گیر نظریاتی چیلنج اور سیکولرزم کے

تحت وجود میں آنے والی عالمی مادی تہذیب کے، ملت اسلامیہ پر ہونے والے اثرات اور سیکولرزم کے پیدا کردہ اشکالات اور اسلامی دنیا میں نظریاتی بحران جیسے موضوعات پر طلبہ کی ذہن سازی کا بھی کسی حد تک انتظام ہو سکے تو دارالعلوم کا یہ پاکستان کی ملت اسلامیہ پر بڑا احسان شمار ہوگا۔ اس کی ایک ابتدائی صورت یہ ہے کہ دارالعلوم سے نکلنے والے رسالہ ''البلاغ'' کو مذہبی واصلاحی نوعیت کے رسالہ سے زیادہ اسے ندوۃ العلماء لکھنو سے نکلنے والے رسالے ''تعمیر حیات'' کی طرح ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کی نشاندہی اور اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے والے مضامین ومواد کے لئے مخصوص کیا جائے اور اس رسالہ کا اردو کے ساتھ عربی، انگریزی اور سندھی ایڈیشن بھی شائع کیا جائے، پاکستان میں اس طرح کا کوئی رسالہ موجود نہیں، خاص طور پر مدارس سے شائع ہونے والے رسالوں میں یہ کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

یہ عاجزانہ مشورہ ہے، شاید اس پر غور وفکر کی صورت پیدا ہو۔

۱۲ اگست ۲۰۱۱ء

گرام قدر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

ہمارے ہاں اندرون سندھ کے دیوبند مکتبہ فکر کے علماء کی قابل ذکر تعداد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے بعض اکابر خلفاء کے بارے میں بڑے اخلاص کے ساتھ یہ سمجھتی ہے کہ وہ انگیر سامراج کے آلہ کار تھے، ریشمی رومال تحریک کو ناکام بنانے، خلافت تحریک کو کمزور کرنے اور ہندستاں کو تقسیم کرکے، پاکستان بنانے کی انگریز کی منصوبہ بندی میں مولانا تھانویؒ اور ان کے خلفاء نے بڑا اہم کردار ادا کیا، مولانا تھانوی کے بھائی پولیس میں آفیسر تھے، ان کے ذریعہ سے انگریز حکومت کے مولانا سے تعلقات مستحکم ہوگئے تھے اور حضرت تھانوی نے ہر سطح پر انگریز حکومت کو مستحکم کرنے اور علمائے کرام کی سامراج دشمنی کی تحریک کو ناکام بنانے میں دل وجان سے ان کے لئے کام کیا۔ مولانا تھانویؒ اور ان کے اکابر خلفاء کے بارے میں سندھ کے دیوبند مکتبہ فکر سے وابستہ مؤثر علماء کرام، پچھلے ستر اسی سال سے اس نقطہ نگاہ کے حامل رہے ہیں، جس کی وجہ سے مولانا اور ان کے خلفاء سے دوری کی دیوار کافی مستحکم رہی ہے اور ان دینی مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کا اب بھی حکیم الامت کے بارے میں یہی ذہن بن رہا ہے۔

حکیم الامت کے بارے میں اس غلط فکر کو مستحکم کرنے کے سلسلہ میں سندھی زبان میں حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ہمعصر'' نے کافی غلط اور منفی کردار ادا کیا ہے۔ یہ کتاب جمعیۃ طلبہ اسلام سندھ کے سابق ناظم محترم نور احمد سندھی صاحب کے ادارہ ''سندھیکا'' نے شائع کی ہے اور مختصر عرصہ میں اس کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور دینی مدارس میں اس کتاب کو برائے نام قیمت پر بڑے پیمانہ پر پھیلایا گیا ہے۔ اس کتاب میں چالیس پچاس صفحات کے ابتدائیہ اور مقدمہ وغیرہ میں تو حکیم الامت کے بارے میں نہایت غلط زبان استعمال کی گئی ہے۔ اور غلط الزامات لگائے گئے ہیں، یہاں تک لکھا گیا ہے کہ انہوں نے ریشمی رومال تحریک میں شامل مجاہد علماء کرام کے نام انگریز کو دے کر، ان کو پھانسیاں دلوائیں۔

اس کتاب میں مولانا تھانویؒ اور ان کے بعض اکابر خلفاء کے بارے میں جس قسم کا ذہن بنانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا اندازہ کتاب کے دوچار حوالوں سے لگایا جا سکتا ہے، جو بیداری جون ۲۰۱۱ء کے شمارے میں اس کتاب پر تفصیلی تنقیدی مطالعہ کے ضمن میں دیئے گئے ہیں، آپ کی خدمت میں ''بیداری'' کا یہ شمارہ ارسال کیا جارہا ہے۔

دیوبند مکتبہ فکر سے وابستہ سندھ کے علماء کرام کے ایک مؤثر طبقہ میں سامراج دشمنی کا جذبہ غیرمعمولی طور پر زیادہ ہے۔ سامراج سے مولانا تھانویؒ کی وفاداری کی فرضی باتیں ان کے ذہن میں اتنی راسخ ہوگئی ہیں کہ وہ یقین کے درجہ تک پہنچ گئی ہیں۔

اس فکر کا اثر ہے کہ سندھ میں پچھلے پچاس ساٹھ سال سے مارکسزم اور کمیونزم کے زیر اثر مالداروں کے خلاف جو تحریک چلتی رہی ہے، عوامی تحریک اور دوسری ترقی

پسند تحریکوں کے زیر اثر دیوبند مکتبہ فکر کے علماء کا قابل ذکر طبقہ اس تحریک کی حمایت کرتا رہا ہے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے بڑے پیمانہ پر خدمت دین کی توفیق اور سعادت عطا فرمائی ہے۔ آپ کے ہاں علماء اور فضلاء کا بڑا طبقہ بھی موجود ہے۔ سندھ کے ان حالات میں ہمیں ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت درپیش ہے، جو مولانا تھانویؒ اور ان کے بعض خلفاء کے اس کردار کی توضیح اور اس کی تفصیل پر مشتمل ہو، جس سے ان کے بارے میں پیدا ہونے والی غلط فہموں کی دوری کو صورت پیدا ہو، تاکہ کم از کم سندھی علماء کی نئی نسلوں کے سامنے اس سلسلہ میں حکیم الامت کی شخصیت کے کردار کا دوسرا رخ، جو صحیح اور حقیقی رخ ہے، سامنے آسکے۔

سندھی آبادی کا علمی طبقہ تشویشناک حد تک سیکولرسٹ، ترقی پسند اور لادین بن چکا ہے۔ سندھ کے بڑے تعلیمی اداروں میں اسلام کا نام لینے والے طلبہ واساتذہ اسلام سے اپنی وابستگی کو چھپانے پر مجبور ہیں۔ ان حالات میں اگر علماء کا قابل ذکر طبقہ بھی ترقی پسندی کی تحریک سے سرمایہ دار دشمنی کے نکتہ کے اتفاق کی وجہ سے ان سے قربت کا تاثر دیتا رہے تو اسلام اور ملت کے نقطہ نگاہ سے یہ بہت تشویشناک بات ہے۔

اس خط لکھنے کا حاصل یہ درخواست کرنی ہے کہ مولانا تھانویؒ کے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالہ کے سلسلہ میں اگر ہمیں ایک علمی اور تحقیقی کتاب فراہم کی جائے اور دارالعلوم کے کسی فاضل کے ذمہ یہ کام سپرد کیا جائے تو یہ آپ کا ہم پر احسان ہوگا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

مولانا عیسیٰ منصوری صاحب

۱۵ مارچ ۲۰۱۳ء

گرامی قدر مولانا عیسیٰ منصوری صاحب

السلام علیکم **مزاج شریف**

''الشریعت کے جنوری ۲۰۱۳ء کے شمارے میں آپ کے دورہ پاکستان کی رپورٹ شایع ہوئی ہے۔

میرے بارے میں آپ کو یہ فکرمندی رہی ہے، جس کا اظہار آپ پچھلے سات آٹھ سال سے فون پر گفتگو کے ذریعہ کرتے رہے ہیں اور ''الشریعت'' کے اس مضمون میں بھی تشویش ظاہر کی ہے کہ میں اپنی صلاحیتیں تصوف واہل تصوف کی حمایت میں ضایع نہ کروں، ایسا کرکے ایک تو علمی اور نظریاتی کاموں میں صرف ہونے والا میرا وقت دکاندارانہ تصوف کی حمایت ووکالت میں صرف ہوجائے گا دوم یہ کہ موجودہ دور کے اہل تصوف کی حمایت کا مطلب دکاندارانہ تصوف کو علم واستدلال کی قوت فراہم کرنا ہے۔

آپ کا یہ فرمانا ہے کہ لندن میں رہ کر پچھلے تیس سال سے تصوف سے وابستہ بزرگوں اور ان کے خلیفوں کا قریب سے مشاہدہ کررہا ہوں، موجودہ دور میں تصوف سے فقر، درویشی، زہد، محبت ورواداری اور اسلامی حمیت اور ملت کی مظلومیت کی فکر اور خدمت اسلام کے اجزاء بڑی حد تک مفقود ہوگئے ہیں۔ تصوف کے نام پر امت کو تقسیم کرکے، اپنے مریدوں کے حلقہ کو مستحکم کرنا، اپنی بزرگی اور اس کے تقدس کا نقش بٹھاکر، غلامانہ ذہنیت اور فکری جمود کو فروغ دینا، مریدوں کی دولت سے روحانی وڈیرہ بننے کے مزاج کا پیدا ہونا، بزرگی اور روحانیت کے نام پر ملنے والی دولت کو اسلام اور ملت کے کاموں میں صرف کرنے کی بجائے اس دولت کو ذاتی جاگیر اور اپنے خاندان کی املاک سمجھنا، مادیت کی عالمگیر لہر کے مقابلہ میں لوگوں کو دین پر قائم رکھنے اور مالدار مریدوں کو آمدنی کے ناجائز ذرائع سے بچانے کی فکر سے قاصر ہونا، ذہنی طور پر افلاس کا شکار ہونا، بہت سارے اہل تصوف کی طرف سے یہ تاثر دینے کی کوشش کرنا کہ وہ خدا کی خاص مخلوق ہیں، ان کی باتیں گویا خدائی باتیں ہیں، ان کی فکر اور ان کے رویے پر

تنقید کا مطلب ہر قسم کے فیوض وبرکات سے محروم ہونا ہے۔

موجودہ دور کے اہل تصوف کے بارے میں آپ کا یہ تجزیہ ایسا ہے، جس کا ایک حد تک مشاہدہ اس عاجز کو بھی ہورہا ہے، اہل تصوف کی یہ حالت زار دیکھکر شدید اذیت ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ملت اب بھی درویش صفت، فقیر منش اور اللہ کی سچی محبت کے رازدانوں سے خالی نہیں، ایسے اہل اللہ موجود ہیں، جن کی صحبت سے دل کی سرد بٹھی گرم ہوتی ہے اور اور عشق ومحبت کا سفر شروع ہوجاتا ہے۔ آپ خود حضرت سید نفیس الحسینی صاحب کے خلیفہ مجاز ہیں۔ آپ کو اس سلسلہ میں مزید کچھ عرض کرنا صحیح نہیں۔

آپ نے غالبا تصوف پر لکھی گئی میری کتابوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میری بیشتر علمی صلاحیتیں تصوف کے حق میں خرچ ہو رہی ہیں۔ آپ ہی نہیں، بلکہ کوئی بھی صاحب علم فرد میری ان کتابوں کو دیکھکر یہ تاثر لینے میں حق بجانب ہوگا کہ تصوف پر بہت زیادہ مواد شائع کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ الحمدللہ اس عاجز نے امت کو درپیش چیلنج، اس کی نوعیت اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں جو کتابیں لکھی اور ترتیب دی ہیں، وہ سو سے زیادہ ہیں۔

ان میں بیشتر کتابیں سندھی زبان میں ہیں، اس لئے کہ سندھ میں الحاد دہریت اور لادینیت کی تحریک انتہائی طاقتور ہے۔

اردو میں بھی الحمدللہ اس عاجز نے جدیدیت کے حوالے سے کافی کتابیں لکھی اور ترتیب دی ہیں ''اسلامی فکر بیسویں صدی میں،'' ''برصغیر ہند کے اسلامیت کے ممتاز شارح'' ''اسلام مسلمان اور تہذیب جدید،'' ''عصر حاضر کی شخصیات میری نظر میں'' ''قرآن اور علم جدید،'' ''اسلام پر اعتراضات کا علمی جائزہ'' ''معاشرہ جدیدیت اور اسلام'' ''اللہ کا پیغام انسانوں کے نام'' ''قومی تعمیروزوال میں نظام تعلیم کا کردار'' ''اسلام اور ملت اسلامیہ عہد جدید میں'' الحمد للہ اس طرح کی بیسیوں کتابیں ہیں، جو اللہ نے اپنے فضل خاص سے لکھنے اور شائع کرنے کی سعادت عطا فرمائی ہے۔

تصوف پر اس عاجز نے جو علمی کام کیا ہے، اس کے پس منظر میں یہ جذبہ کام کررہا ہے کہ تصوف ہمارا ایسا تہذیبی ادارہ ہے، جس سے امت کی عظیم یادیں اور اس کی تاریخ وابستہ ہے اور یہ ادارہ ہر دور میں بے شمار انسانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنا ہے۔ موجودہ دور میں تصوف میں بڑھتی ہوئی خرابیوں کا ایک سبب یہ ہے کہ معاشرہ کا ذہین اور باصلاحیت طبقہ تصوف سے دور ہے۔ جس کی وجہ سے تصوف کو بہتر صلاحیتوں کے حامل افراد بہت کم مل رہے ہیں۔ تصوف سے استفادہ کے بغیر ملت کی اجتماعی بہبود اور اسلامی تحریک کا کام ہاتھ میں لینا نفسی خرابیوں اور فساد کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

تصوف پر میرے کام کا دوسرا محرک یہ ہے کہ جدید دور کے بیشتر اسلامی مفکروں نے اپنی فکر میں تصوف سے صرف نظر کیا ہے، روحانیت سے عاری خشک فکر اور فلسفہ سے حقیقی اسلامی تحریک جنم لے سکے اور طاقتور ہوسکے، دشوار تر ہے۔ ان حالات میں ضرورت تھی کہ تصوف اور اس کی حقیقت اور اس کی اصلیت پر پرانی اصطلاحات اور پرانے اسلوب سے ہٹ کر، جدید ذہنی سطح اور جدید استدلال سے علمی کام کیا جائے۔

جہاں تک میری صلاحیتوں کے استعمال کا تعلق ہے تو وہ الحمدللہ علمی اور نظریاتی کاموں اور اپنی اصلاح اور ساتھیوں کی تربیت میں صرف ہورہی ہیں، سندھی زبان میں ہر ماہ شائع ہونے والا ہمارا ''بیداری'' رسالہ خالص علمی اور نظریاتی نوعیت کا ہے اور اور جدیدیت سے مرعوبیت کے خاتمہ، مادہ پرست نظریات پر علمی تنقید اور اسلام کی جدید اسلوب اور نہج میں پیشکش کے کام ہی کے لئے مخصوص ہے۔

اس عاجز کا تجزیہ یہ ہے کہ ہم جس دور میں رہ رہے ہیں، وہ دجالی تہذیب کے عروج کا دور ہے اور مادیت پرستی کی عالمگیر تحریک ساری رکاوٹیں عبور کرکے، گھروں تک پہنچ چکی ہے، مادیت کی اس ہمہ گیر عالمی تحریک کا اثر ہے کہ اہل مذہب ہوں یا اہل تصوف، ان کے دلوں میں بھی دنیا و دولت کے جذبات کروٹ لے رہے ہیں اور معاشرہ میں ممتاز بن کر رہنے کی آرزوئیں فروغ پذیر ہو رہی ہیں۔ اس صورتحال سے بچاؤ کی صورت اللہ سے مستحکم تعلق اور اندر میں ڈوب کر خود احتسابی کے بغیر اور کوئی نظر نہیں آتا۔

خط لمبا ہوگیا ہے، جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

سید منور حسن صاحب

سید منور حسن صاحب، جماعت اسلامی میں ذکر وفکر کی شخصیت ہیں۔ ہمارے حضرت سید زوار حسین صاحبؒ سے ان کا تعلق تھا، مراقبہ کا انہیں کافی ملکہ حاصل ہے، لیکن جس ذکر وفکر کے ذریعہ ان کی شخصیت میں نکھار پیدا ہوا ہے، اسے حکمت کے ساتھ جماعت کے اجتماعی نظام کا حصہ بنانے کے سلسلہ میں ہمت وحوصلہ کی کمی ہے۔ محترم قاضی حسین احمدؒ نے معاشرہ کو اپنا ہمہ آہنگ بنائے بغیر مصنوعی طور پر سیاسی قوت حاصل کرنے کے لئے جس طرح اپنی ساری توانائیاں اس ہدف میں خرچ کی، جماعت کے رخ کو صبغۃ اللہ کی صورت دینے کے لئے اسی طرح کے حوصلہ کی ضرورت ہے۔ سید منور حسن صاحب اگر غور وفکر کرکے اس سلسلہ میں بہتر حکمت عملی ترتیب دیں تو شاید کچھ پیش قدمی ہوسکتی ہے۔ اس سے جماعت اسلامی میں قیل وقال کے غازیوں سے زیادہ عمل کے غازیوں کی تعداد بڑھتی جائے گی۔

۳ جون ۲۰۱۳ء

محترم جناب گرامی قدر سید منور حسن صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان

السلام علیکم : مزاج شریف

کراچی میں دو تین بڑے بزرگوں (جو ممتاز عالم دین بھی تھے) کی نشست تھی، بڑے دردمند اور وسیع الفکر بزرگ تھے، وہ کہرے تھے کہ کاش، جماعت اسلامی اپنے تربیتی نظام کو سلف صالحین کے خطوط پر استوار کرے اور رفاہی کاموں پر خصوصی توجہ دے اور ان کاموں کو انتخابات میں فوری طرح پر کیش نہ کرے تو توقع ہے کہ یہ ملک میں اسلامی نقطہ نگاہ سے بہت بڑی قوت بن سکتی ہے۔ وہ مزید کہرے تھے کہ کاش کہ ایسی صورت پیدا ہو کہ ہمارا یہ نکتہ نگاہ جماعت اسلامی کی مرکزی قیادت تک پہنچ جائے یا ان سے تفصیلی نشست کی صورت پیدا ہو۔

ان کا کہنا تھا کہ ملک میں سیاسی تبدیلی اور اسلامی نقطہ نگاہ سے سیاسی خال کو جماعت اسلامی ہی پُر کرسکتی ہے، لیکن اس کے لئے تربیت کے ذریعہ کارکنوں کی سیرت وکردار کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح اخوان المسلموں کے کارکنوں کی تربیت ہوئی ہے۔ اسی انداز کی تربیت کی ضرورت ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے ۱۹۴۸ء میں اخوان المسلموں کے مرکزی اجتماع میں قاہرہ میں تقریر کی تھی، جو ان کی فکر اور حکمت عملی پر تنقیدی نوعیت کی تقریر ہے۔ اس تقریر کو اخوان نے اپنے نصاب میں شامل کر لیا تھا، جو،اب بھی ان کے نصاب میں شامل ہے۔ کاش کہ جماعت میں بھی یہ وسعت پیدا ہوجائے۔ ورنہ موجودہ صورتحال میں یعنی موجودہ تربیتی سسٹم کے تحت آنے والے کئی انتخابات میں یہی صورت رہے گی، جو، اب ہے، دینی جماعتوں سے اتحاد کی وجہ سے وہ تھوڑی بہت سیٹیں تو لے سکتی ہے، لیکن اپنی تحریکی قوت اور تنظیمی صلاحیتوں اور کارکنوں کی سیرت وکردار کی خوشبو سے وہ نتیجہ خیز کامیابی حاصل کر سکے، دشوار تر ہے۔

مولانا عزیز صاحب اور ان کے دوساتھی علماء کے اس نکتہ نگاہ کو آپ کے سامنے پیش کرنا، اس عاجز نے ضروری سمجھا۔ ان کا درد ایسا تھا کہ اسلام کی خاطر گویا جماعت اسلامی کی محبت ان کے دلوں میں موجزن ہے، وہ ممتاز علماء، جماعت کی مرکزی قیادت سے مل کر اپنا نقطہ نگاہ پیش کرنے کی آرزو بھی رکھتے تھے۔

اس عاجز نے اس سلسلہ میں ایک مضمون بھی لکھا ہے، جس میں معاشرہ کو اسلامی نقطہ نگاہ سے بدل کر سیاسی قوت حاصل کرنے میں جماعت کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے، ''بیداری'' کا وہ شمارہ ارسال خدمت ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں وسعت نظری کے ساتھ فروغ دین کے کام کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے ہاں قبولیت کا شرف عطا فرمائے۔ (آمین)

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب، سندھ میں علم وادب اور تحقیق کی منفرد شخصیت تھے۔ سندھ کی تاریخ، سندھی زبان، لوک ادب، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور تعلیم کے موضوع پر ان کا کام ایسا ہے، جو مثالی نوعیت کا کام ہے، ڈاکٹر صاحب بظاہر اتنے گہرے مذہبی نظر نہیں آتے تھے، وہ ترقی پسندوں، قوم پرستوں اور لادین حلقوں کے پروگراموں میں مقرر یا مہمان خصوصی کی حیثیت سے مستقلا شریک ہوتے رہتے تھے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سندھ میں علمی وادبی محاذ پر اسلامیت اور لادینیت کے درمیاں موجود کشمکش میں غیر جانبدار ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا، ڈاکٹر صاحب، جو سندھ کی تاریخ کے سب سے بڑے محقق تھے، ان کی اس حیثیت کی وجہ سے لادین حلقے انہیں اپنے پروگراموں میں صدر یا مہمان خصوصی یا مقرر کی حیثیت سے بلانے پر مجبور تھے، ڈاکٹر صاحب، ان کی نشستوں میں حکمت سے ایسی باتیں کہتے تھے، جس سے سندھ کی تاریخ اور ادب وغیرہ کے حوالے سے سندھ کی پاکیزہ تہذیب کی بات ان کے سامنے آسکے، ڈاکٹر صاحب کی یہ حکمت عملی ان کی شخصیت کے اعتبار سے موزوں ومناسب تھی۔

ڈاکٹر صاحب عمر کے آخری حصہ میں ہمارے دفتر تشریف لائے تھے، انہوں نے کافی رقم ہمارے حوالے کی تھی، میں نے جب اس کی رسید انہیں ڈاک کے ذریعہ ارسال کی تو انہوں نے فون کرکے کہا کہ یہ رقم میں نے آپ کے ادارہ کو نہیں، آپ کو ذاتی طور پر دی تھی، اس لئے کہ آپ نے اپنی ساری صلاحیتیں اسلام کے نظریاتی وعلمی کام میں فنا کردی ہیں۔ آپ جیسی شخصیتوں سے تعاون کرنا، یہ بجائے خود سعادت کی بات ہے، آپ نے یہ بھی کہا کہ آپ نے رسید بھیج کر ناانصافی کی ہے۔

۲۲اپریل ۲۰۱۱ء

محترم جناب گرامی قدر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب

السلام علیکم: مزاج شریف

آپ چلنے پھرنے کی استعداد نہ رکھنے کے باوجود ہمارے ادارہ میں تشریف لائے اور ہمارے ساتھ مالی تعاون فرمایا، اس کے لئے دل کی گہرائیوں سے ممنوں ہوں اور دعا گو بھی۔

آپ نے سندھ میں بڑھتی ہوئی ترقی پسند اور سیکولرسٹ تحریک پر سخت فکر مندی کا اظہار کیا اور علماء کرام کی طرف سے اس فکری تحریک کو سمجھکر، اس طرف توجہ نہ دینے پر اپنے دلی کرب کا اظہار فرمایا۔ آپ کا کہنا تھا کہ سندھ کے اہم شہروں میں ''سندھی ادبی سنگت'' کی طرز پر نوجوان ادیبوں کو ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنے کا کام شروع ہونا چاہئے، جس کے تحت تخلیقی وادبی صلاحیتوں کے حامل نوجوانوں سے رابطے وتعلقات کی صورت پیدا ہو اور انہیں مادہ پرست اور ترقی پسندی کے علمبرداروں کے چنگل میں جانے سے بچایا جائے۔

میرے بارے میں آپ کی یہ تجویز کہ تم علمی اور نظریاتی سطح پر جو کام کررہے ہو، اسے مستعدی کے ساتھ کرتے رہو، البتہ تم اپنی فکر سے متاثر نوجوانوں کو تلاش کرکے، ان سے رابطہ رکھکر، انہیں اگر اس کام کے لئے بھی آمادہ کرسکو تو بہتر ہے اور سندھی نوجوانوں کو ادبی پلیٹ فارم مہیا کرنے کا محاذ ایسا ہے، جو خالی ہے، اس محاذ پر بہتر اور مؤثر طور پر کام کرنا، وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

آپ کا یہ بھی کہنا تھا کہ سندھ کی تاریخ میں پہلی بار ہماری پڑھی لکھی آبادی، شعوری طور پر اپنی پاکیزہ تہذیب اور اپنی اعتقادی بنیادوں سے باغی ہوئی ہے اورمارکسزم اور سیکولرزم پر سینکڑوں سے زیادہ ادیب اور اہل قلم تیار ہوئے ہیں، جو بہت زیادہ تشویشناک بات ہے۔

اس عاجز سے آپ کی جب بھی ملاقات ہوئی ہے، آپ نے سندھ میں لادینیت کی بڑھتی ہوئی نظریاتی تحریک پر اپنی سخت فکرمندی اور تشویش ظاہر فرمائی ہے اور ہمارے ادارہ کے تحت ہونے والے علمی کام پر آپ نے اپنی مسرت کا اظہار فرمایا ہے۔

لادین نظریاتی تحریک کی فروغ پذیری پر آپ کی تشویش دراصل آپ کی دینی حمیت کی علامت ہے، جو اللہ کو بہت محبوب ہے۔

ہماری کوشش تو یہی ہے کہ اہم شہروں میں ہماری فکر سے متاثر نوجوانوں کو اس کام کے لئے تیار کریں، لیکن علمی وادبی صلاحیتوں کے حامل مستقل مزاجی سے کام

کرنے والے افراد نہیں ملتے، ہم نے تصوف اور روحانیت کے محاذ پر تو سندھ کے بعض اہم شہروں میں افراد کا ایک گروہ تیار کیا ہے، جو روحانی سکون اور اپنی اصلاح کے لئے ذکر ومراقبہ کے حلقہ سے وابستہ ہوگیا ہے، ان میں ادبی وعلمی صلاحیتوں کے حامل افراد بھی شامل ہیں، ہماری کوشش ہے کہ ان افراد میں ادبی محاذ پر کام کرنے کا شعور ابھارا جائے۔

ایک بار پھر دل کی گہرائیوں سے ممنوں ہوں کہ آپ عمر رسیدگی اور علالت کے باوجود ہمارے ہاں تشریف لائے اور سندھ میں نظریاتی کام کے حوالے سے اپنے دلی جذبات سے ہماری سرد دل کو گرم کیا اور خود ہمارے جذبہ میں اضافہ فرمایا۔

رسید ارسال خدمت ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

وائس چانسلر صاحبان

زیر نظر خط اپنی ایک کتاب ''قومی تعمیر وزوال میں نظام تعلیم کا کردار'' کے ساتھ ملک بھر کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر صاحبان اور ماہرینِ تعلیم کو ارسال کیا گیا تھا، یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحبان کو کتاب کی دس دس کاپیاں ارسال کی گئی تھیں اور درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اپنے اساتذہ میں کتاب کے مواد کو متعارف فرما کر احسان فرمائیں، اگر آپ نے دلچسپی ظاہر فرمائی تو آنجناب کی خدمت میں کتاب کی مزید کاپیاں ارسال کی جائیں گی، لیکن وائس چانسلر صاحبان نے عملا کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا، البتہ کتاب کی وصول کی رسمی طور پر رسید ارسال فرمائی، موجودہ بے حسی کے دور میں یہ بات بھی بجائے خود احسان سے کم نہیں۔

۱۹ ستمبر ۲۰۰۶ء

محترم جناب گرامی قدر وائس چانسلر، سربراہانِ ادارہ اور ماہرینِ تعلیم صاحبان

السلام علیکم : مزاج شریف

آج ہمارا وطنِ عزیز سیاسی، معاشی اور اخلاقی اعتبار سے جس زبوں حالی سے دوچار ہے اور ہماری نسلیں مادہ پرست تہذیب پر فدا ہوکر، اسلامی اور انسانی اقدار سے جس تیزی سے عاری ہورہی ہیں، یہ ایسی صورتحال ہے، جو آپ جیسے ماہرینِ تعلیم اور دانشورانِ ملت کے لئے از حد تشویشناک ہونے کے ساتھ ساتھ غور وفکر کی مستحق بھی ہے۔

آپ بہتر طور پر جانتے ہیں کہ قوم وملت کو ہر قسم کی قیادت تعلیمی ادارے ہی فراہم کرتے ہیں۔ ہماری ہر قسم کی لیڈر شپ وہ چاہے سیاسی ہو یا کاروباری یا انتظامی وسماجی، وہ تعلیمی اداروں ہی کی مرہونِ منت ہے۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے ہر سال ملک کو ایسے لاکھوں افراد کار فراہم کرتے ہیں، جو قوم وملت کے اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھنے کی بجائے نفس پروری اور نفس پرستی کی خاطر ملی مفاد کو پامال کرنے اور عالمی شاہوکار کے ہاتھوں فروخت ہونے اور ملک میں مہنگائی، رشوت، بدنظمی، لاقانونیت، بددیانتی اور خیانت کو فروغ دینے اور کروڑوں لوگوں کی زندگیوں کو

اجیرن بنانے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ اس طرح جدید تعلیم یافتہ طبقات اپنے کردار اور رویے سے قوم وملت کے لئے عذاب کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

ہمارے اہل سیاست، ملک وقوم کے ساتھ مذاق کی جو روش اختیار کئے ہوئے ہیں، وہ آئے دن کے اخبارات کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔ ہمارے اہل صنعت واہلِ تجارت، ملٹی نیشنلز کے ساتھ ملی بھگت کرکے، مالدار بننے کی خاطر قوم کا خون جس طرح نچوڑ رہے ہیں، وہ سب پر واضح ہے۔ ہماری نوکر شاہی قومی پالیسیوں کی تشکیل میں عالمگیریت کے مقاصد کے لئے اور قوم کو غلامی کی نئی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے جس تحرک کا مظاہرہ کررہی ہے، وہ ایسی المناک حقیقت ہے، جو خون کے آنسو رُلانے والی ہے۔ سماجی خدمت کے نام پر این جی اوز، ملٹی نیشنلز اور عالمی شاہوکار سے پیسے لے کر ہمارے معاشرتی ڈھانچہ کو زیر وزبر کرنے اور ہمارے صدیوں کے تہذیبی تسلسل کے خاتمہ کے لئے جس طرح کوشاں ہے، اس سے ہم سب آشنا ہیں۔

یہ حالات ایسے ہیں، جس پر غور وفکر کرکے، اگر اس کے تدارک کا انتظام نہ کیا گیا تو یقین جانیں کہ آپ کی اور ہماری نسلوں کے لئے ذلت آمیز غلامی کے سوا کوئی راہ باقی نہ رہے گی۔ یقیناً آپ اپنی نسلوں کو طوق غلامی میں دیکھنا ہرگز گوارا نہ کریں گے۔ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو دانشور ملت اور ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے آپ اس صورتحال کے اسباب پر جتنا بھی غور فرمائیں گے، آپ کو نظر آئے گا کہ ملک کی موجودہ زبوں حالی اور اقدار کی تباہی اور اخلاقی مفاسد کی واحد ذمہ داری ہمارے نظامِ تعلیم پر ہی عائد ہوتی ہے، جو قوم کو بے کردار، نفس پرست، مفاد پرست اور مادہ پرست حکمران، سیاستدان، تاجر، صنعتکار، افسر، کلرک، صحافی، فنکار اور دانشور فراہم کررہا ہے۔

اگر نظام تعلیم میں نصاب کی خرابیوں کے باوجود اساتذہ کرام ہی اپنی ذمہ داریاں بہتر طور پر سرانجام دیتے اور وہ طلبہ کی تعلیم وتربیت میں پاکیزہ نصب العین کی اہمیت کو اجاگر کرنے پر زور دیتے اور نصب العین سے محبت کے جذبہ کو ابھارنے کا فریضہ سرانجام دیتے تو قوم کو یقیناً بہتر سیاستدان، بہتر تاجر وصنعتکار، بہتر سماجی کارکن، بہتر صحافی واہلِ علم، بہتر افسر اور کلرک میسر آتے، لیکن ایسا نہ ہونے کا جو نتیجہ آج ہم بھگت رہے ہیں، وہ بہت المناک اور تشویشناک ہے۔

ہمارے فلسفہ تعلیم میں وہ کیا نقائص ہیں، جس کی وجہ سے ہم ملی زوال سے دوچار ہیں۔ یہ سب سے بنیادی اور اہم سوال ہے۔ اس سوال کے صحیح جواب سے ہی ساری قومی تعمیر وابستہ ہے۔ نظامِ تعلیم کی صحیح وغلط فلسفیانہ بنیادوں سے آشنائی سے ہی صحیح ملی تعمیر کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا احساس پیدا ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں، میں آنجناب کی خدمت میں ملک کے مایہ ناز فلسفی ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے تعلیمی افکار کے خلاصہ پر مشتمل کتاب ''قومی تعمیر و زوال میں نظامِ تعلیم کا کردار'' کی دس کاپیاں ارسال کررہا ہوں۔ آپ اگر وقت نکال کر خود بھی اس کتاب کا غور سے مطالعہ فرمائیں اور اپنی درس گاہ کے ذہین اور ذمہ دار اساتذہ کو بھی تاکید سے اس کے مطالعہ کی درخواست فرمائیں تو یہ آپ کا نہ صرف راقم الحروف پر بلکہ ملک وقوم پر بھی احسان ہوگا۔

امید ہے کہ راقم الحروف کی اس درخواست کو روزمرہ کے معمول اور روایتی کاموں کی حیثیت دینے کی بجائے اسے خصوصی اہمیت دیں گے۔ اگر آپ نے دلچسپی کا مظاہرہ فرمایا تو میں آپ کی خدمت میں زیرِ نظر کتاب کی مزید اعزازی کاپیاں ارسال کروں گا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم سب کو اپنے فرائض کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے۔

خط کے الفاظ اور جملوں میں اگر کہیں تلخی موجود ہوتو اس کے لئے یہ عاجز دل کی گہرائیوں سے معافی کا طالب ہے۔

والسلام
محمد موسیٰ بھٹو
ایڈیٹر

ماہنامہ ''بیداری'' حیدرآباد

سربراہ اشاعتی ادارہ

۱۹۹۹ء میں ملک کے ایک اشاعتی ادارہ، جس کی طرف سے ہفتہ وار رسالہ بھی نکلتا تھا، اس ادارہ کی دو اہم شخصیات تصادم کا شکار ہوگئیں، جس کی اس وقت کے اخبارات میں بھی خبریں شائع ہونے لگیں۔ جس پر راقم الحروف کو تشویش لاحق ہوئی، ادارہ کی ایک اہم شخصیت سے راقم نے ملاقات کرکے، اسے نرم مزاجی سے کام لے کر ادارہ کے بقا کی استدعا کی۔ اس شخصیت نے ہماری درخواست کو اہمیت دی، اس کے بعد ہم نے انہیں حالات کی بہتری کے سلسلہ میں مختلف خطوط لکھے، ایک اہم خط جسے اسے لکھے گئے سارے خطوط کا خلاصہ سمجھئے۔ وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے، یہاں ہم بوجوہ ان شخصیت کا نام نہیں دے رہے ہیں۔

۱۳ فروری ۱۹۹۹ء

محترم جناب سربراہ اشاعتی ادارہ صاحب

السلام علیکم ۔

آپ کا خط ملا، محترم ..... کے خط کی نقل رساں خدمت ہے۔ آپ بڑی آزمائش سے گزرے۔

صبر کے نتیجہ میں انشاء اللہ آخرت میں اجر عظیم حاصل ہوگا۔ اتنا اجر کہ بے اختیار کہا جائیگا کہ یہ تو اللہ نے ہم پر فضل فرمایا کہ ہمیں تکلیف میں مبتلا کرکے اور صبر کی توفیق دے کر، اتنے بلند درجات سے نوازا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بندہ کو آخرت میں جب اس کی تکالیف کا اجر دیا جائیگا تو وہ کہیگا کہ کاش مجھے دنیا میں کوئی نعمت حاصل نہ ہوتی، وہاں مصائب ہی مصائب کا سامنا ہوتا، تاکہ یہاں اس کے اجر اور درجات سے نوازا جاتا۔

انسان کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ اشتعال اور غیظ وغضب کے جذبات ہیں، جس سے فرد کو اپنے آپ کو بچانا مشکل ہوتا ہے۔ اشتعال کی یہ نفسیات خاص طور پر ذمہ دار، عہدیدار، با اختیار افراد کیلئے سخت پریشانی کا موجب بن جاتی ہے۔ آپ ایک ادارہ کی ذمہ دار شخصیت ہیں، آپ کو بھی اس سے واسطہ پڑا ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ماتحتوں پر غصہ آئیگا۔ اس غصہ کو حداعتدال میں رکھنا، ضروری ہے، ایک عارف باللہ نے غصہ کے اثرات ونتائج کے بارے میں بہت عمدہ نکتہ بیان کیا ہے۔ اور اس کے اثرات واضح کئے ہیں۔ آپ کے ملاحظہ کیلئے لکھتا ہوں:

ایک بڑے اصول کی بات یہ ہے کہ کسی کی غلطی اور بے اصولی پر غصہ نہ ہونا چاہئے۔ ورنہ اپنے اندر فساد برپا ہوجائیگا۔ ہاں غلط باتوں پر غمگین اور غمزدہ ہوکر دعا کرنا، اس سے اپنی اصلاح ہوگی۔ غصہ کرنے کا مقام ہر ایک کا نہیں۔ یہ مقام یا تو استاد کا ہے، طالبعلم کے اوپر یا بادشاہ کا ہے، رعیت کے اوپر، یا ماں باپ کا ہے اولاد کے اوپر، یا خاوند کا ہے، بیوی کے اوپر، اس کے علاوہ اگر کوئی غصہ کریگا تو شیطان ایسے شر کو سامنے لائیگا کہ غصہ کرنے والے کے اندر عیوب پیدا کریگا اور وہ دوسروں کی اصلاح کے پیچھے پڑیگا، اسے اپنی اصلاح کی فکر نہ ہوگی۔''

بزرگوں کے بیان کردہ اس نکتہ کا استحضار بھی ضروری ہے کہ لوگوں میں فضیلت اور قدر وقیمت اسی فرد کو حاصل ہوتی ہے، جو ان کی ناانصافیوں، زیادتیوں، بے جا مخالفت اور گرانے کی کوششوں کے جواب میں صبر تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کرتا ہے اور ان کی ساری غلط حرکتوں کے باوجود ان سے محبت آمیز رویہ اختیار کرتا ہے۔ اور اپنے دل کو ان کی حرکتوں سے آلودہ کرنے اور اپنے کردار سے اس کے منفی اثرات کا مظاہرہ کرنے کی بجائے سراپا صبر اور سراپا محبت بن جاتا ہے۔

ایسا فرد ہی اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی محبت دلوں میں ڈال دی جاتی ہے، اس کے لئے مخالفوں تک کی دلیں ہموار کردی جاتی ہیں اور اداروں، گروہوں اور ساتھیوں میں لیڈر شپ ایسے افراد ہی کو عطا کی جاتی ہے۔ اور ان کے لئے حالات سازگار کردیئے جاتے ہیں۔

یہ کتنی بڑی سعادت ہے، جو صبر، وسعت قلبی، محبت اور لوگوں کے قصور معاف کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔

جب صبر اور بے جا رویے کے جواب میں مزید محبت کی صلاحیت عطا ہوتی ہے تو اداروں، جماعتوں، گروہوں، انجموں میں آنے والے بحران اور خلفشار ازخود دور ہونے لگتے ہیں اور حاسدانہ کارروائیاں اور غیظ وغضب کے جذبات اور سازشیں پاکیزہ جذبات اور پاکیزہ کردار سے ٹکرا کر ناکام ہوجاتے ہیں۔

غصہ اور اشتعال کے مزاج کے بارے میں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ایسا فرد خود بھی اضطراب کے انگاروں پر لیٹتا رہتا ہے تو اپنے متعلقین کے لئے بھی زندگی کو عذاب بنا دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اشتعال سے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔ انتقام بازی کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، دوسروں کی حق تلفی، اذیت رسانی اور تحقیر وتذلیل ہوتی ہے۔ غصہ سے فرد متاثرین ومتعلقین کی آہوں کے اثرات میں گھر جاتا ہے۔ غصہ کا مزاج دراصل کبر اور انانیت سے جنم لیتا اور فروغ پذیر ہوتا ہے۔ جو ام الامراض ہے، جس سے بہت ساری بُرائیاں جنم لیتی ہیں۔

اس سلسلہ میں کچھ احادیث ملاحظہ ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا، جھگڑا بھائیوں کے درمیاں دشمنی کی آگ بھڑکا دیتا ہے۔

آپ نے مزید فرمایا: کیا میں تمہیں اہل دوزخ کی خبر نہ دوں، ہر وہ شخص جو سخت مزاج، سخت جھگڑالو اور متکبر ہے۔

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا، جو شخص جھگڑا ترک کردے ایسی حالت میں کہ وہ ناحق ہو اور غلطی پر ہو تو اس کے لئے جنت میں ایک کنارے پر گھر تعمیر کیا جائے گا اور جو شخص حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا ترک کردے تو اس کے لئے جنت کے درمیاں گھر بنایا جائے گا۔

قرآن نے خوشگوار باہمی تعلقات کے لئے ایک بنیادی اصول بیان کیا ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ باہم ایسی گفتگو کی جائے جس سے دوسروں کی تکریم ہو، **وَقُل لِّعِبَادِیْ یَقُولُواْ الَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّیْطَانَ یَنزَغُ بَیْنَهُمْ.** میرے بندوں کو کہدو کہ وہ (تبادلہ خیال کے وقت) اچھی (اور بہتر) گفتگو کریں، بے شک شیطان تمہارے درمیاں فساد پیدا کرنا چاہتا ہے۔

فَاتَّقُواْ اللّهَ وَأَصْلِحُواْ ذَاتَ بِیْنِکُمْ . پس اللہ سے ڈرو اور ایک دوسرے کے ساتھ صلح کے ساتھ رہو۔

آپ کے حالات کی بہتری کے لئے جو نکات لکھے ہیں، وہ آپ کے لئے اسی وقت افادیت کے حامل بن سکتے ہیں یا آپ ان سے صحیح طور پر اسی وقت استفادہ کرسکتے ہیں، جب دل کی بیداری، اس کی سلامتی، اس کے متوجہ الی اللہ ہونے اور اس کی نرمی، سوزساز اور خشیت کی فکر کریں گے۔ اس لئے کہ سخت دل یعنی قساوت قلبی ایسی بیماری ہے، جس کی موجودگی میں بہتر سے بہتر باتیں بھی عقل سے ٹکرا کر نکل جاتی ہیں۔ دل جب سلامتی سے قریب ہوتا ہے اور اس میں خشیت اور رقت کا غلبہ ہونے لگتا ہے تو ایسا دل عمل صالح کے اعتبار سے طاقتور ہوتا ہے اور اصلاح ونصیحت کی ہر بات اسے اپنے روح کی غذا معلوم ہوتی ہے۔ دنیا میں سخت دل یعنی قساوت قلبی سے بڑھکر کوئی سزا نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ قساوت قلبی کا مریض فرد بے حس ہوتا ہے، اس پر نصیحت کی کوئی بات کارگر نہیں ہوتی۔ خون جگر سے لکھی گئی باتیں بھی اس کے لئے کاغذ کے بے کار ٹکڑے سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہوتی، قساوت قلبی کا حامل فرد دانشور ہو یا عالم، استاد ہو یا تجربہ کار انسان، سب کی حالت یہی ہوتی ہے۔ وہ جوہر انسانیت سے محروم ہوتا ہے، وہ دل کے سازوں کو سمجھنے کی صلاحیت سے قاصر ہوتا ہے، صاحباں دل کی ساری توجہات کے باوجود وہ پتھر دل ہی رہتا ہے۔ ایسے افراد غصہ واشتعال سے بچ کر، صحیح فیصلے کرسکیں، مشکل ہے، دل کے دروازوں کی بندش کی وجہ سے وہ نہ تو مذہب کی روح تک رسائی حاصل کرسکتا ہے اور نہ صحیح انسانی تجربات ومشاہدات سے استفادہ کرسکتا ہے۔ شرارت، ٹکراؤ، اپنی بڑائی کے احساسات اور دوسروں کی تحقیر کی نفسیات سے بلند ہونا اس کے لئے ممکن نہیں۔

آپ کی طلب کی وجہ سے یہ باتیں دل سے نکل گئی ہیں۔ اللہ کرے ان سے استفادہ کی صورت پیدا ہو۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب ہزاروی

۲۲ فروری ۲۰۱۱ء

محترم جناب گرامی قدر حضرت مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی صاحب

السلام علیکم **مزاج شریف**

آپ نے اس عاجز اور سیہ کار کو یاد فرمایا اور مفتی محمد سعید صاحب کو جواب دیتے ہوئے اس عاجز کے لئے پچیس صفحات مخصوص کے گئے ہیں۔ ساٹھ صفحات کے طویل خط میں محض اس عاجز کے لئے پچیس صفحات لکھنا، یہ اس بات کی شاہدی ہے کہ دل میں محبت کا تعلق موجود ہے، تبھی تو یاد فرمایا گیا ہوں۔

اس عاجز کے لئے یہی سعادت کوئی کم سعادت نہیں ہے کہ مجھے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ نے یاد فرمایا ہے۔

آپ کی اطلاع وعلم کے لئے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس عاجز کا جماعت اسلامی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ۱۹۸۵ء سے پہلے اس عاجز کا جماعت اسلامی سے رکنیت کا تعلق تھا۔ لیکن تزکیہ، تصوف وروحانیت کی کمی کی جماعت کی فکر نے اس عاجز کو اہل اللہ کی صحبت اختیار کرکے، اپنی اصلاح کی راہ پر گامزن کیا اور تصوف واحسان کی اصلیت، اس کی حقیقت، اسلام میں اس کی اہمیت وضرورت کے موضوع پر اس عاجز نے ۱۷ سے زائد کتابیں لکھی اور ترتیب دی ہیں۔ جس میں'' تصوف واہل تصوف سلف وخلف کی نظر میں'' اور''خزینہ شریعت ومعرفت'' اور''شاہ لطیف کے کلام کی تشریح'' جیسی ضخیم کتابیں شامل ہیں۔

یہ عاجز چونکہ علمی اور فکری مزاج کا حامل ہے، اس لئے مختلف مفکروں کے فکر کا مطالعہ اور ان کی فکر کے مثبت وصحتمند پہلوؤں کے ساتھ کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کرنا، یہ اس عاجز کے پیشہ صحافت وتصنیف وتالیف میں شامل ہے۔ آپ کی طرف سے میری جن تحریروں سے مجھے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کا فکری پیروکار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ ایسے اقتباسات ہیں، جو سیاق وسباق سے جدا کرکے ان سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

مجھے کوئی شکایت نہیں، اخلاص کے باوجود ایسا ہوجاتا ہے۔

آخر میں ایک بار پھر میں آپ کا مشکورہوں کہ آپ جیسی شخصیت نے مجھے یاد فرمایا ہے۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی

مولانا الطاف الرحمٰن صاحب، پشاور کے سب سے بڑے مدرسہ کے صدر مدرس ہیں۔ ساری زندگی پڑھنے پڑھانے میں گذری ہے، بہتر تدریس کے معاملہ میں ان کی کافی شہرت ہے۔ وسیع مطالعہ کے حامل ہیں۔ مدرسہ میں تدریس کے ساتھ عرصہ سے مسجد میں خطابت کا فریضہ بھی سرانجام دیتے رہے ہیں، ان سے فیض حاصل کرنے والے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے۔ موصوف ملک کے نظام کی اسلامی بنیادوں پر تبدیلی کے سلسلہ میں فکرمند رہتے ہیں۔ انقلابی فکر کے حامل ہیں۔ اس عاجز کے ساتھ محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔

۲ اکتوبر ۲۰۱۳ء

محترم جناب گرامی قدر حضرت مولانا الطاف الرحمٰن صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

پاکستان میں انتخابی سیاست کی خرابیوں اور اسلامی نقطہ نگاہ سے تبدیلیٔ حکومت کے لئے دوسرے راستہ کے انتخاب کے سلسلہ میں آپ کے سیمینار میں شرکت کی دعوت ملی، یہ عاجز سیمنار میں شریک نہ ہو سکا، جس کے لئے معافی کا خواہاں ہے۔ آپ سے یہ معلوم کرکے، خوشی ہوئی کہ سیمینار میں ڈیڑھ سو سے زیادہ علمائے کرام شریک ہوئے، زیادہ تر پختون علمائے کرام تھے، نیز طے ہوا کہ آئندہ سیمینار اسلام آباد یا لاہور میں منعقد ہوگا، جس میں ملک بھر کے علمائے کرام کو شرکت کی دعوت دی جائے گی۔

اسلام اور پاکستانی ملت کے لئے آپ کی فکرمندی اور آپ کی جدوجہد نہ صرف قابل قدر ہے، بلکہ دوسروں کے لئے قابل تقلید بھی ہے، اللہ کرے آئندہ سیمینار سے ملکی سطح پر تبدیلیٔ سیاست کے لئے علماء کی طرف سے کوئی بہتر عملی پروگرام تشکیل ہوسکے۔

اس عاجز کے خیال میں ملکی سیاست کی تبدیلی کے لئے انقلابی طریق کار ہو یا کوئی دوسری تدبیر، اس طرح کی ساری منصوبہ بندی کی کامیابی کا گہرا تعلق معاشرہ کی اخلاقی طور پر تبدیلی سے ہے۔

ہمارا معاشرہ پچھلے پچاس ساٹھ سال سے جس تیز رفتاری سے مادیت میں مستغرق ہورہا ہے، وہ ایسی خوفناک صورتحال ہے، جس کے نتائج انتہائی تباہ کن ہیں، معاشرہ کی صحتمند خطوط پر تبدیلی کے لئے ہمہ گیر وہمہ جہتی تحریک کے بغیر نظام حکومت میں تبدیلی کی ساری کاوشیں نتائج کے اعتبار سے غیرمؤثر ہی رہیں گی۔

اب معاشرہ کی حالت یہ ہے کہ سیاسی قیادت، اسمبلی ممبران اور وزراء صاحبان بددیانی اور لوٹ مار کے ذریعہ کروڑ پتی اور ارب پتی بننے سے کم پر کسی صورت راضی نہیں، ہمارے افسران کی حالت بھی یہی ہے کہ ہر شعبہ زندگی کے مخصوص بجٹ کا بڑا حصہ وہ وزراء اور ٹھیکیداروں سے ملی بھگت کرکے ہضم کرجاتے ہیں۔ پچھلے ساٹھ سال میں ایسے لاکھوں افسران ہوں گے، جن کی ساری جائداد رشوت اور لوٹ مار کے پیسے سے بنی ہے۔ ہمارے صنعتکار اور بڑے تاجروں کی بھی حالت یہ ہے کہ وہ افسروں سے ملی بھگت کے ذریعہ اربہا روپے کی ٹیکس ہضم کرجاتے ہیں اور قوم پر مصنوعی طور پر مہنگائی کا عذاب مسلط کرنے کی کاوشوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمارے ڈاکٹروں کی حالت یہ ہے کہ مریضوں سے بھاری فیس لیتے ہیں اور آپریشن کی ضرورت ہو یا نہ ہو، انہیں خوفزدہ کرکے،آپریشن پر آمادہ کرتے ہیں، اس طرح ان سے لاکھوں روپے بٹورتے رہتے ہیں۔ پورے ملک کے ڈاکٹروں نے جو لوٹ مار مچا رکھی ہے اور اللہ کی غریب مخلوق کو جس عذاب میں مبتلا کیا ہے، وہ تشویشناک بات ہے۔

یہی حالت ملک کے ہر طبقہ سے وابستہ افراد کی ہے۔ ملک کے مؤثر اور اہم طبقات کے تقریبا ۹۵ فیصد افراد حب مال کے آخری حد تک مریض بن چکے ہیں اور اس کے حصول کے لئے وہ قومی خزانے کے ساتھ ساتھ عوام کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑنے کے حریص ہیں۔ پچھلے پندرہ بیس سال سے صوبہ پختونخوا اور بلوچستان میں صوبائی حکومت میں شامل دینی سیاسی جماعت سے وابستہ وزراء کے اس طرح کے بہت سارے قصے اخبارات کی زینت بنتے رہے ہیں کہ وہ کس طرح دولت کی گنگا میں ہاتھ

دھونے کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ پچھلے چند سالوں سے مضاربہ کے نام پر مذہبی افراد سے اربہا روپے لے کر، انہیں ہضم کرنے کی خبریں تو اب اخبارات کی زینت بن رہی ہیں۔

معاشرہ کی یہ اخلاقی ابتری کی صورت ایسی ہے، جو کسی سیاست یا انقلابی تبدیلی سے دور ہو سکے، مشکل ہے، جس دودھ میں زہر ہوگا، اس سے جو مکھن تیار ہوگا، وہ زہریلا ہی ہوگا۔ ملکوں اور قوموں کو ہر سطح کی قیادت اور نظام کو چلانے کے لئے افراد کار معاشرہ سے ہی ملتے ہیں، معاشرہ اگر اخلاقی طور پر فساد زدہ ہے، خیر اور بہتری کو قبول کرنے کی اس کی استعداد بڑی حد تک مضمحل ہوگئی ہے، اگر معاشرہ کا اجتماعی ضمیر سو گیا ہے تو اس طرح کے معاشرہ کو اوپر کی کوئی تبدیلی دینی اور اخلاقی طور پر بچا سکے، مشکل ہے۔ ذہنی، اخلاقی اور عملی بگاڑ کا علاج ہاتھوں کی تبدیلی نہیں ہے، بلکہ دلوں، ذہنوں اور نفسیات کی صحتمند بنیادوں پر تبدیلی ہی ہے۔

اس سلسلہ میں بھی اگر معاشرہ کا جائزہ لیا جائے تو پاکیزہ اخلاقی نصب العین اور فکر ونظر کی تبدیلی کے سلسلہ میں معاشرہ میں زبردست خلا موجود ہے۔ معاشرہ میں کوئی ایسی طاقتور تحریک موجود نہیں، جو اس کے سارے مؤثر اور متحرک طبقات میں موجود صحتمند فکر کے حامل افراد کے تعاون سے ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ لے اور انہیں مادیت کے جنون سے نکال کر انسانیت کے شایانِ شان کردار کا حامل بنانے کے لئے کوشاں ہو اور جو جدید طبقات سے جدید اسلوب اور ان کی ذہنی سطح کے مطابق انہیں قوموں کے زوال میں ان کی اخلاقی خرابیوں کے عمل دخل سے آگاہ کرے اور اس کام کو تحریک کی صورت دے۔

اگر اس سلسلہ میں ملک بھر کے علماء کرام جمعہ کی تقریروں میں معاشرہ کی بڑھتی ہوئی تباہی میں اپنے ہی طبقات کے کردار اور مادی جنون کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ذہنی ونفسیاتی بیماریوں اور رشوت اور لوٹ مار سے حاصل شدہ پیسے کی بے برکتی اور اخلاقی پاکیزگی سے قوموں کی سربلندی جیسے موضوعات کو بنیاد بنائیں اور بہتر علمی اسلوب میں ان موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کرتے رہیں تو اس کے بھی بہتر نتائج نکل سکتے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں ہمارے خطیبوں اور مقرروں کی جو حالت ہے، وہ افسوسناک ہے۔ عام طور پر ملک بھر کی مساجد سے اپنے فرقہ اور گروہ کی برتری، دوسرے مسلکوں اور گروہوں کی تردید وتکذیب اور فروعاتی مسائل پر زور ہوتا ہے۔

اس عاجز کی نظر میں اگر علماء کرام، وقت کے چیلنج کو سمجھکر صحیح خطوط پر کام کریں، طلبہ کی بہتر تربیت کا فریضہ سرانجام دیں تو ہماری سیاست اور ہماری ساری اجتماعی زندگی میں بہتری کی صورت پیدا ہوسکتی ہے پھر اسلحہ اٹھانے اور انقلابی طرز پر سوچنے کی ضرورت ہی لاحق نہ ہوگی۔

وقت کا چیلنج یہ ہے کہ ایک تو سیکولر نظریات ہیں، جن کا اس وقت دنیا میں چلن ہے، جس کے مطابق انسان کو اپنے جملہ مسائل کے حل کے لئے آسمان کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، علماء کرام کے ذریعہ طلبہ میں ان مادی نظریات کا شعور پیدا ہو، اسلام سے ان کے تقابلی مطالعہ کی استعداد پیدا ہو، تاکہ ہماری جدید نسلیں جو جدید تعلیمی اداروں سے وابستہ ہیں، اور جو ملک کے سارے نظام کو چلانے کے کام پر فائز ہوتی ہیں، انہیں ان مادی نظریات کے سحر میں جانے سے بچایا جا سکے۔ دوسرا بنیادی کام جو کرنے کا ہے، وہ یہ ہے کہ اس وقت مادیت کا عالمگیر سیلاب ہے، عالم اسلام اور پاکستان کی پوری ملت بُری طرح اس کی زد میں ہے، ہر فرد چند دنوں کی مادی خوشحالی اور رونق کی خاطر اپنی پاکیزہ اقدار اور اپنی پاکیزہ تہذیب سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہے۔ اس کا علاج ایمان، یقین، اخلاص، للھیت، توکل اور آخرت کا استحضار ہے، یہ ساری پاکیزہ چیزیں، دینی مدارس میں اللہ کی محبت ومعرفت کی فضا پیدا کرنے سے ہی پیدا ہوسکتی ہیں۔

ملک بھر کے دینی مدارس میں کم از کم چار پانچ لاکھ طلبہ تو ضرور پڑھتے ہوں گے۔ اگر طلبہ میں جدید مادی نظریات، جس پر دنیا بھر کے تمدن وتہذیب کی عمارت قائم ہے، ان نظریات کی کمزوریوں کا ادراک پیدا ہو، اور مادیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں خود بھی بہنے سے بچاؤ کی صلاحیت پیدا ہو اور افراد معاشرہ کو بھی اس سے بچانے کا جذبہ وحوصلہ پیدا ہو تو یقین جانیں کہ اس کام ہی سے معاشرہ کے بڑھتے ہوئے بگاڑ میں بڑی حد تک کمی آسکتی ہے اور معاشرہ کو اسلام سے ہمہ آہنگ تاجر، آفیسر، وکیل، سیاسی کارکن اور سیاسی قیادت وغیرہ بھی مل سکتی ہے۔

ملک کی موجودہ حالت زار کا بنیادی سبب ہی یہی ہے کہ ہمارے سارے جدید طبقات بُری طرح جدید افکار کی غلامی میں مبتلا ہیں اور دولت کا جنوں ان کے مزاج اور نفسیات کا حصہ بن چکا ہے۔ علماء کرام خلا میں نہیں رہتے، وہ اس معاشرہ کا مؤثر طبقہ ہیں۔ جمعہ کے خطبات کے ذریعہ ہر ہفتہ کروڑہا افراد سے ان کا رابطہ رہتا ہے۔ لوگ مذہبی نوعیت کے مسائل کے سلسلہ میں بھی ان سے رجوع ہونے پر مجبور ہیں۔

میری تجویز یہ ہے کہ علماء کرام کے آئندہ سیمینار میں اس نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ ملک کے نظام میں جمہوریت اور انقلابی طریقہ کار کے تحت تبدیلی کے لئے جو جماعتیں کام کررہی ہیں، وہ بھلی یہ کام کرتی رہیں، لیکن دینی مدارس سے وابستہ علمائے کرام تو ایسے کام کی تیاری میں لگیں گے، جس سے آنے والے دس سالوں میں معاشرہ کو ایسے لاکھوں علماء کرام ملنا شروع ہوں گے، جو جدیدیت وسیکولرزم کی طرف سے معاشرہ کو درپیش فکری وعلمی ونظریاتی چیلنج سے مقابلہ کا فریضہ بھی سرانجام دیں گے تو ساتھ ساتھ اپنی ایمانی حرارت سے افراد معاشرہ میں دولت اور دنیا کے حوالے سے بڑھتے ہوئے جنوں کو کم کرکے، ملی حمیت کے جذبات کو فروغ دینے کا کردار بھی ادا کریں گے۔

اس عاجز نے اس موضوع کے بیشتر پہلوؤں پر تفصیل سے غور کیا ہے۔ اس کی کافی تفصیل ہماری کتاب ''صدائے محبت'' میں موجود ہے۔

کاش کہ ایسی صورت پیدا ہو کہ علمائے کرام ہمارے درد کو اپنا درد سمجھیں اور ہمیں اپنے طبقہ سے باہر کا فرد سمجھکر، اس باہر کی آواز کو اہمیت نہ دینے کی روایت پر صرف نظر کریں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام
احقر
محمد موسیٰ بھٹو

مولانا احسان الحق الحسینی صاحب

مولانا احسان الحق الحسینی صاحب، صاحب دل بزرگ ہیں، امت کے لئے درد رکھتے ہیں۔ اللہ کی محبت کے پیغام کو عام کرنے کے لئے فکرمند رہتے ہیں اور اس کے لئے اپنی بیشتر توانائیاں صرف کررہے ہیں۔ مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں۔ اور عالمگیر مادی تہذیب کی طرف سے امت کو درپیش چیلنج کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔

۸ مارچ ۲۰۱۱ء

محترم جناب گرامی قدر حضرت مولانا احسان الحق الحسینی صاحب

السلام علیکم: مزاج شریف

آپ کے کام اور حالات کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں اللہ تعالیٰ آپ سے خدمت دین اور لوگوں کی اصلاح کا بڑا کام لینا چاہتا ہے۔

کام کی استعداد پیدا کرنے کے لئے اللہ کی جو سنت کارفرما رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اس فرد اور شخصیت کو باطن میں نفس سے حالت کشمکش میں رکھنے کے ساتھ ساتھ خارجی طور پر بھی اسے بہت ساری مخالفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنوں اور غیروں سب کی مخالفت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اسے صبر وشکر اور استقامت کے بہتر مقام پر فائز کیا جائے۔

انبیاء کرام سے لے کر بڑے بڑے علمائے ربانی کو ان مراحل سے گزارا گیا ہے۔ ان مراحل سے گزارے بغیر بڑے پیمانہ پر کام کی استعداد کا پیدا ہونا دشوار تر ہے۔ اس لئے کہ ایسی شخصیت کے لئے صبر تحمل وبردباری، توکل، قناعت، منکسرالمزاجی، ہر طرح کے حالات میں اشتعال میں نہ آنے، مخالفت کے جواب میں دعائیں دیتے رہنے اور **تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ** جیسے اوصاف اور نفسیات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ یہ اوصاف اور یہ نفسیات، نفس کے ساتھ شدید کشمکش اور خارجی مخالفت کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی۔

اس نکتہ کو ذہن میں رکھا جائے تو آپ غور فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ آپ کی تربیت کرکے، آپ کو تجربات کے مراحل سے گزار کر، آپ کو مستحکم کیا جارہا ہے۔ اس میں استقامت کے لئے ذکر ومراقبہ سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوگا۔ اس مراقبہ سے اتنا نور آجاتا ہے کہ فرد آہستہ آہستہ رضا باالقضا کے مقام پر فائز ہونے لگتا ہے۔

آپ کو اس معاملہ میں بالکل مطمئن ہونا چاہئے کہ آپ نے جو کچھ کیا، صحیح کیا ہے۔ اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب بھی پریشانی لاحق ہو، آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹہ کی اندر میں غوطہ زنی کر لیا کریں۔ ان شاء اللہ بے پناہ خود اعتمادی پیدا ہوگی۔

ہمیں پچھلے چالیس سال کے دوران اس طرح کی بہت ساری مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہر مخالفت کے وقت اللہ نے اپنے ذکر اور صحبت کی بدولت ثابت قدم رکھا ہے اور مزید آگے بڑھایا ہے۔

عجلت میں چند باتیں عرض کی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

خالد جامعی صاحب

خالدجامعی صاحب ہمارے ملک کے ممتاز دانشور ومحقق ہیں۔ اسلامی فکر میں غیراسلامی فکر کے اثرات اور جدیدیت کے موضوع پر ان کا مطالعہ غیرمعمولی طور پر وسیع ہے، اس وقت ہمارے ملک میں اس معاملہ میں شاید ہی ان کا کوئی ثانی ہو ۔ موصوف کے اسلامی فکر کے اجزاء بڑی حد تک صحیح ہیں، وہ اسلامی دعوت کے فروغ کے لئے بڑا جذبہ رکھتے ہیں۔ سیکولرزم اور جدیدیت سے ان کی بیزاری ونفرت دوسرے اہل دانش کے لئے قابل تقلید ہے۔ خالد جامعی صاحب کے نام ہمارے خطوط میں کافی سختی موجود ہے، اس سختی کا سبب یہ تھا کہ موصوف نے ایک عرصہ تک بڑی بڑی فاضل اسلامی شخصیتوں کو ہدف تنقید بنایا تھا۔ علامہ اقبال کے بارے میں ان کے تنقیدی مضامین نے تو پنجاب کے اہل علم میں ہلچل برپا کر دی تھی۔

محترم خالد جامعی صاحب کے نام ہمارے زیرنظر خطوط، موصوف کے مسلسل اصرار پر لکھے گئے تھے اور بڑی مسرت کی بات یہ ہے کہ ان خطوط پر نہ صرف یہ کہ وہ ناراض نہ ہوئے، بلکہ اس کے بعد آہستہ آہستہ ان کے تنقیدی لب ولہجہ میں بہت بہتری واقع ہوئی اور تنقید میں دردمندی اور اور محبت آمیز انداز کا غلبہ ہوا۔

ان خطوط کے بعد بھی موصوف سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ لیکن بعد کے خطوط کی نقل محفوظ نہیں۔

زیرنظر خطوط کے سخت اسلوب بیان پر ہم محترم خالد جامعی صاحب سے دل کی گہرائیوں سے معافی کے خواہاں ہیں۔

۳۰ اپریل ۲۰۰۵ء

برادر محترم خالد جامعی صاحب

السلام علیکم: مزاج شریف

آج آپ کو ایک عریضہ لکھ چکا تھا کہ کچھ اور نکات ذہن کے نقش پر ابھرنے لگے۔ یہ نکات آپ سے زیادہ میرے اپنے نفس کے لئے مفید وکارآمد ہیں۔ آپ کے نام لکھنے کا مطلب مجھے اپنے نفس کو یاددہانی کرانی ہے۔

میرا نفس اگر یہ چاہنے لگے کہ علم وفضل اور جدیدیت کو سمجھنے میں مجھ سے زیادہ کوئی فاضل نہیں۔ علامہ اقبال، مولانا انور شاہ کاشمیری، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، مولانا علی میاں، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد تقی عثمانی، علامہ یوسف القرضاوی، مولانا زاہد الراشدی، ڈاکٹر محمود احمد غازی وغیرہ یہ سب جدیدیت کی حقیقت کو سمجھنے میں یا تو ناکام ہیں یا پھر اس معاملہ میں ان کا مطالعہ محدود ہے، یا پھر یہ شخصیات جدیدیت سے مرعوب ہیں اور ان کا فہمِ اسلام ناقص ہے، میرے نفس کی یہ رائے دراصل دعویٰ کا نتیجہ ہے۔ نفس کو سختی سے انتباہ دے کر، اس کی اس رائے کو ہرگز اہمیت نہ دینا چاہئے۔ نفس کے اس فتویٰ کو صحیح سمجھنے اور اسے حقیقت کی حیثیت سے پیش کرنے کے نتیجہ میں ایک تو جذبہ دعویٰ اور انانیت میں رسوخ ہوتا چلا جاتا ہے، دوم یہ کہ اس سے مسلم معاشرہ میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے اور اپنے حامیوں کا ایک حلقہ سب کی تردید وتحقیر کرنے لگتا ہے۔ سوم یہ کہ مسلم معاشرہ کی اس طرح کی اہم شخصیات پر اعتماد مجروح ہونے لگتا ہے۔ چہارم یہ کہ اس دعویٰ کے ساتھ کام کرنے کے نتیجے میں اپنے کام کے نتائج بھی آخر وقت تک نہیں نکلنے پاتے۔

انسانی نفسیات کے اصل ماہر صوفیائے کرام ہی ہیں۔ میں اپنے نفس کی اس عویٰ کو اگر اپنے بزرگ کے سامنے پیش کروں تو وہ جو فتویٰ دے سکتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ فتویٰ اس فتویٰ سے مختلف نہ ہوگا، جو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے ایک مرید (جو جامع مسجد میں خطیب تھے، جن کی تقریر پر بڑی داد دی جاتی تھی، لیکن ان کا نفس اس داد سے محظوظ ہوتا تھا اور اسے اپنے کامیابی تصور کرتا تھا) کو رائے دی تھی کہ ''وہ ایک سال کے لئے خطابت کرنا بند کردیں۔ دوسری صورت میں تمہاری اصلاح دشوار ہوجائے گی۔''

قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا واقعہ بھی مشہور ہے، جو انہوں نے خود بیان کیا تھا کہ انہیں یہ زعم ہونے لگا تھا کہ برصغیر میں حدیث میں مہارت کے معاملہ میں وہ سب سے ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سامنے اپنا یہ مرض پیش کیا تو مولانا نے ان سے دو ماہ تک نمازیوں کے جوتے درست کروائے۔

دعویٰ بہت خطرناک چیز ہے اور نفس کا سب سے خطرناک حربہ ہے، دعویٰ کے نتیجہ میں مسلم معاشرہ کی مسلمہ شخصیتوں کی تردید وتحقیر ہونے لگتی ہے اور اپنی شخصیت کے سحر کو مستحکم کرنے کا کام ہوتا رہتا ہے اور یہ سارا کام دین کے نام پر خدمت علم اور تحقیق کے نام پر ہوتا رہتا ہے۔

مجھے اپنے نفس کے اس فریب پر متنبہ ہونا چاہئے اور نفس کو یہ نکتہ سمجھانا چاہئے کہ معاشرہ میں علم وفضل کی حامل شخصیتیں برسہائے برس کی جدوجہد کے بعد کہیں جاکر ایک مقام حاصل کرتی ہیں اور ان کا اخلاص، ان کی جہدوجہد، ان کا مطالعہ اور ان کا غور وفکر اور دین کے لئے ان کا جذبہ اور مسلسل استقامت کے بعد کہیں جاکر تیس چالیس سال میں شخصیتوں کو علم وفضل کی مسند حاصل ہوتی ہے اور انہیں احترام کی حیثیت ملتی ہے۔ اس طرح کی شخصیتوں کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ یہ جدیدیت سے نابلد ہیں اور نئے دور کے حقائق کے فہم سے قاصر ہیں اور تشریح اسلام کے سلسلہ میں ان کی فکر سراپا غلط ہے، اس دعویٰ کا مفہوم اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ اصل تو میں ہی ہوں، جو علم وفضل اور فہمِ حقائق میں ان سب سے بلند ہوں۔ اس طرح کی دعویٰ کے نتیجہ میں علمی حلقوں میں میرے بارے میں جو رائے بن سکتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ رائے یہی ہوگی کہ یہ شخص دعویٰ کے خبط میں مبتلا ہے۔ دوسروں کی علمیت کی تردید کے ساتھ اسلام کی جو خدمت ہوتی ہے، وہ نتائج کے اعتبار سے بھی لاحاصل ہوجاتی ہے۔

اپنی علمیت چاہے کتنی زیادہ ہو، اپنے مضمون میں چاہے سیکڑوں ہزاروں کتابوں کے حوالے ہوں، اگر اس کام میں مسلمہ اہلِ علم کی تردید وتکذیب ہو یا ان کی علمی تحقیر ہو یا ان کی نیتوں پر حملہ ہو تو اپنی ساری علمیت اور اپنی ساری تحقیق کے باوجود معاشرہ،

فرد کو داعیٔ اسلام یا خادم اسلام کی حیثیت دینے اور اسے مخلص ودردمند اہلِ علم سمجھنے کے لئے تیار ہو، مشکل ہے۔

مجھے آپ سے محبت ہے، آپ ان افراد میں شامل ہیں، جو خدمتِ دین کا جذبہ رکھتے ہیں اور جو ہر قسم کے حالات میں معاشرہ میں اپنا اسلامی کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کے رسالہ کا پرانہ قاری ہوں، چونکہ اپنے نفس کے حوالہ سے اس طرح کے تجربات موجود ہیں، اس لئے علم، ذہانت اور قبل از وقت مقام ملنے سے یہ جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ خوش قسمت ہیں، وہ افراد جو نفس کے فریب سے مطلع ہو کر، اس کی اصلاح کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور اپنا دعوتی کردار اس طرح ادا کرنے لگتے ہیں کہ اہل علم کی عزت، توقیر کرکے ان کی دعاؤں کے مستحق بنتے ہیں۔

یہ خط لکھا جا چکا تھا کہ آپ کا دوسرا عنایت نامہ ملا، آپ نے اصرار سے لکھا ہے کہ میں آپ کی فکر اور تحریر کی کمزوریوں کی نشاندہی کروں۔ آپ کی اس مخلصانہ پیشکش کے لئے میں آپ کا ازحد ممنوں ہوں۔ لیکن چونکہ اپنے نفس کے حوالہ سے یہ ذاتی مشاہدہ وتجربہ ہے کہ نفس باقی سب کچھ برداشت کرسکتا ہے، اپنی شخصیت اور اپنی فکر پر تنقید برداشت کرنا، اس کے لئے سب سے زیادہ دشوار کام ہے۔ تنقید سے نفس مشتعل ہوجاتا ہے اور ضد کی نفسیات کا شکار ہوجاتا ہے۔

اپنی غلطیوں کو سمجھنے اور اپنے فکر کے نقائص کے ادراک کی سب سے بہتر اور مؤثر صورت وہی ہے، جسے حدیثِ رسول ﷺ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ہر معاملہ میں اپنے اندر کے مفتی سے فتویٰ پوچھا کرو، لوگوں کی فتویٰ کو صحیح نہ سمجھا کرو۔

اندر کا مفتی جسے ضمیر اور نفس لوامہ بھی کہا جاتا ہے، وہ جب بیدار ہوتا ہے تو زندگی کے ہر معاملہ میں وہ فتویٰ دینے لگتا ہے، جو حق وصداقت کی حامل فتویٰ ہوتی ہے۔ لیکن اندر کے مفتی کے سلسلہ میں ہم میں سے تقریبا ہر شخص کی یہ حالت ہوتی ہے کہ زندگی کے بیشتر معاملات میں آغاز کار میں اس کی آواز اور اس کی کھٹک نہ سننے اور اس کی فتویٰ کو مسترد کرنے کے نتیجہ میں ہوتا یہ ہے کہ اندر کا یہ مفتی سوجاتا ہے اور نفس لوامہ ایک حد تک اپنا کام کرنا بند کردیتا ہے اور وہ فرد وافراد کو نفس امارہ کے حوالہ کردیتا ہے کہ وہ جس وادی میں چاہے اسے بھٹکاتا پھرے۔

اندر کے مفتی کے سوجانے کی وجہ سے قدرت کا ایک اٹل قانون لاگو ہوجاتا ہے، جسے قرآن میں **انَّ اللّٰہَ یَحُولُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ** کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ انسان اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہوجاتا ہے۔ قلب کی اصلاح کے راستہ میں اللہ کا حائل ہونا یا روک بن جانا، یہ فرد کی اپنی مجرمانہ غفلت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً نفس لوامہ شروع میں ہر فرد کو دعویٰ (اپنے فضل وکمال کے صاحب ہونے) کے نتائج سے واقف کرتا ہے اور اس سے دستبردار ہونے کے لئے اکساتا رہتا ہے، لیکن ضمیر کی بار بار کی خلش، اضطراب اور اکساہٹ کے باوجود جب فرد دعویٰ سے دستبردار ہونے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تو اس معاملہ میں نفس لوامہ، فرد کو نفس امارہ کے حوالہ کردیتا ہے۔ اس کے بعد حالت یہ ہوجاتی ہے کہ فرد، زندگی بھر انانیت، کبر اور دعویٰ کی راہ پر گامزن ہونے لگتا ہے اور اس راہ کے ارتقائی مراحل طے کرکے، اس معاملہ میں ناقابلِ اصلاح حالت تک پہنچ جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا کے اس لاگو قانون سے بچاؤ اور اپنی اصلاح کی بھی کوئی صورت موجود ہے؟ یقیناً اس کی صورت موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر نماز میں ہم **صِرَاطَ الَّذِیْنَ أَنعَمتَ عَلَیْھِمْ** (ان کا راستہ دکھا جن پر تونے نعمت کی ہے) دعا مانگتے ہیں، ایسے انعام یافتہ لوگوں کی صحبت ومعیت اختیار کی جائے۔ جسے قرآن میں دوسری جگہ **یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّٰہَ وَکُونُواْ مَعَ الصَّادِقِیْنَ** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ صادقین جو قول وعمل کے سچے ہوتے ہیں، جو اللہ کی محبت سے سرشار ہوتے ہیں۔ ان کی پاکیزہ صحبت کی برکت سے دعویٰ، حب جاہ وحب مال جیسے امراض کا ازالہ ہونے لگتا ہے اور باطل مستحکم عادتیں مضمحل ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ لیکن فرد کے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ بڑے بڑے معاملات میں نفس لوامہ یعنی اندر کے مفتی کی مسلسل فتاؤں پر متنبہ ہونے کی بجائے اس سے انکار وسرکشی کی راہ اختیار کرتا ہے تو کچھ عرصہ کے بعد احساسِ گناہ کا ادراک ہی سلب ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے افراد کے لئے صادقین کی صحبت کا تصور ہی سوہانِ روح ہوتا ہے۔

اس معاملہ میں جدید علم نفسیات کا یہ نکتہ بڑا اہم ہے کہ فرد، جب خاص نہج پر

مسلسل سوچتا رہتا ہے اور اس سوچ کے مطابق عمل بھی کرتا رہتا ہے تو اس سے ذہن میں سوچ کے راستے پیدا ہوجاتے ہیں۔ آگے چل کر یہ راستے شاہراہ کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یعنی فکر کے نتیجہ میں ذہن میں شاہراہیں بن جاتی ہیں، جن شاہراہوں پر فرد مسلسل چلتا رہتا ہے، ان شاہراہوں کو مٹا کر نئی شاہراہوں کا تعین کرنا اور ان شاہراہوں پر گامزن ہونا جتنا مشکل ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

اس عاجز کی نظر میں اس دور میں اسلام کا کام کرنے والوں کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے کام کا آغاز ہی یا تو انقلاب کے نعرہ اور تبدیلیٔ حکومت کے کام سے کرتے ہیں۔ یا پھر ان کے پیش نظر اصل اصلاح دوسروں کی مقصود ہوتی ہے۔ جہاں تک اپنی ذاتی اصلاح، تہذیب نفس، ضبط نفس اور قلب کو قلب سلیم بنانے اور ایمان ویقین کی حالت کو مستحکم کرنے اور اس کے ذریعہ اخلاق حسنہ واخلاق فاضلہ کا حامل بننے جیسے بنیادی کاموں کا تعلق ہے تو یہ سارے کام ایسے ہیں، جو ان کے فکری سانچہ اور اہداف میں قابلِ ذکر اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔ جدید اسلامی فکر کے حامل افراد کے اس فکری نقص کا نتیجہ ہے کہ انقلاب اور تعمیر معاشرہ اور ذہنی ونظریاتی تبدیلی کے مقام پر فائز افراد کی بیشتر صلاحیتیں یا تو ایک دوسرے کی تردید میں صرف ہونے لگتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ قیل وقال میں۔

خط طویل ہوگیا، جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اس خط کو تنقید برائے تنقید تصور نہ فرمائیں، جیسا کہ شروع میں عرض کیا ہے کہ یہ خط اپنے ہی نفس کے حالات کی عکاسی ہے۔ شاید اس لکھنے سے اپنے ہی نفس کو انتباہ ہوجائے اور وہ دعوتِ دین کے نام پر دوسروں کی تردید وتنقیص اور اذیت رسانی کی حرکتوں سے باز آجائے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۱۷ مئی ۲۰۰۵ء

برادر عزیز خالد جامعی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

آپ کا بلا تاریخ کا عنایت نامہ ملا۔ ازحد مشکور ہوں، اس بات پر تو مزید خوشی ہوئی کہ آپ نے تنقید کو خوش دلی سے قبول فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ظرف کی بدولت آپ کو اپنی محبت کی دولت عظمیٰ کا جزوعطا فرمائے۔

ہمارے ہاں بزرگوں کا صدیوں سے یہ طریقہ رہا ہے کہ معاشرہ میں دعوتی کام، وہ چاہے علمی ہو یا عملی، اس کی اجازت انہی افراد کو دیتے تھے، جو اصلاحِ نفس کے کچھ مراحل سے گذر کر، مقام انسانیت سے آشنا ہوجاتے تھے، اس لئے کہ تہذیب نفس کے بغیر دعوتی کام سے اصلاح کم ہوتی ہے، جب کہ فساد زیادہ پھیلتا ہے۔ جب میری دل کی آنکھیں ابھی احترام انسانیت کی بصارت سے آشنا ہی نہ ہوسکی ہیں۔ اس کی سرے سے روشنی ہی مدہم ہے تو ایسی صورت میں، میں جو بھی علمی، تحریری اور عملی طور پر فروغ اسلام کے لئے دعوتی کام کروں گا، نور بصیرت سے خالی ہونے کی وجہ سے اس میں فساد وانتشار وافتراق اور بندگانِ خدا کی دل آزاری کے جراثیم زیادہ شامل ہوں گے۔ اس طرح کے علمی کام سے کاغذ پر خوبصورت الفاظ کے نقوش تو ثبت ہوجائیں گے اور پڑھنے والوں کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا، لیکن چونکہ اس طرح کے علمی کام میں دل کی تاریکی کے اثرات گہرے شامل ہوں گے، اس لئے نہ صرف یہ کہ دلوں کی اصلاح کے سلسلہ میں اس طرح کا دعوتی کام اور تحریریں مفید ثابت نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دلوں کی تاریکی اور کدورتوں کو بڑھانے کا موجب بن جاتی ہیں۔

بزرگانِ دین، جو انسانی نفسیات کے مشاہداتی مراحل سے گذر کر نفس انسانی کی گہرائیوں سے پوری طرح آشنا ہوتے ہیں، وہ مبتدیوں کو قائد بن کر دعوتِ اسلام کے محاذ پر سرگرم کردار ادا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دیتے، اس لئے کہ ایسا کام مبتدی کے لئے خود بھی ابتلا و آزمائش اور فتنہ کا موجب ہوتا ہے تو مدعو افراد کے لئے بھی۔ چونکہ مدعو، داعی کی خطابی اور علمی صلاحیت سے متاثر ہو کر، اس کے عقیدتمند ہوجاتے ہیں، انہیں مبتدی کی تاریکیٔ دل کا ادراک نہیں ہوتا، اس لئے ان کے دل مبتدی داعی

اور قلم کار کے تاریکیٔ دل کے اثرات سے سرشار ہوئے بغیر رہ نہیں سکتیں۔ ہمارے موجودہ معاشرہ میں اسلام، اسلامیت اور خدمتِ اسلام اور غلبہ اسلام کے کام کے حوالہ سے جو بھی انتشار اور باہمی کدورتیں موجود ہیں، اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ دل کی آنکھوں کو ایک حد تک نورِ بصیرت سے بہرہ ور کئے بغیر اور اس کام کو فیصلہ کن اہمیت دیئے بغیر ہر باصلاحیت فرد جدوجہد اسلام کے مقام پر فائز ہوجاتا ہے، حضورﷺ نے جس طرح قرآن وحدیث کے ظاہری علوم منتقل فرمائے ہیں، اسی طرح آپ نے نورِ نبوت کی کیفیات بھی صحبت کے ذریعہ منتقل فرمائی ہیں، جو صحابہ کرام سے لے کر اب تک سلف میں منتقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ افسوس ہے کہ پاکیزہ صحبت کے ذریعہ ایمان ویقین، تقویٰ اور نور نبوت کے اجزاء کی منتقلی کے بغیر ہم محض ظاہری علم کی بنا پر اسلام کے لئے قائدانہ کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا جو نتیجہ ظاہر ہوسکتا ہے، وہ ظاہر ہوا ہے کہ قائدوں اور دانشوروں کی زندگیاں رونق، خوشی، خوش کرداری اور حسنِ اخلاق سے خالی ہیں، اس کا اثر ان کے پیروکاروں پر بھی ہے۔

ضرورت ہے کہ ہم کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر، حکیم اور انجنیئر بننے کی بجائے کچھ وقت کے لئے صبر کے ساتھ ماہروں کی صحبت میں رہ کر، کتابی علوم کو مشاہداتی وتجرباتی علوم کی صورت دیں۔ ورنہ جس طرح کتابی حکیم، کتابی ڈاکٹر اور کتابی انجنیئر مریضوں کے علاج اور تعمیرات کے نام پر معاشرہ وافراد معاشرہ کو بحران میں مبتلا کردیتے ہیں، اسی طرح تزکیہ اور نورِ نبوت کے اجزاء سے محروم اہل علم ودانشور معاشرہ کو ہولناک فساد ہی سے دوچار کر سکتے ہیں، بلکہ کرتے رہے ہیں اور اب بھی کررہے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ طلب عطا فرمائے، جس سے ہم اپنے نفس کی اصلاح کے کام کی اہمیت کو سمجھ سکیں اور اس راہ پر گامزن ہوسکیں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۹ جون ۲۰۰۵ء

برادر عزیز خالد جامعی صاحب

السلام علیکم مزاج شریف

ساحل کا جون کا شمارہ ملا اور آپ کا خط بھی۔

''روایت اور جدیدیت کی کشمکش'' کا مضمون پڑھا۔ اس مضمون کے علمی وتحقیقی ہونے میں تو شک نہیں، لیکن ساحل میں اس طرح کے تنقیدی مضامین جو پچھلے آٹھ دس سال سے پڑھنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں، وہ ایک تو خاص زاویہ نگاہ سے لکھے ہوتے ہیں، وہ زاویہ نگاہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے تقریبا سارے اسلامی فاضل جدیدیت کے صحیح فہم نہ ہونے کی وجہ سے اس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ومرعوب ہیں، اس لئے ان کی تشریحِ اسلام میں جدیدیت کی آمیزش شامل ہے۔ دوم یہ کہ اس طرح کے مضامین، وحدتِ امت کے نقطہ نگاہ سے افادیت کی بجائے سخت مضر ہیں۔

تنقید میں جو جذبہ محبت ہونا چاہئے، وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر تنقید میں اصل چیز جو دیکھنے کی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ فاضلوں کا بنیادی اسلامی فکر صحیح ہے یا غلط، آپ کے تنقیدی مضامین میں بنیادی اسلامی فکر پر بحث کرنے کی بجائے ہر اسلامی فاضل کے کسی بھی ایک پہلو، ایک جزو یا ایک نکتہ یا ایک جملہ کو لے کر اس کی شخصیت کو متنازعہ بنانے اور اس کی اسلامی فکر کو مسترد کرنے کی کاوش ہوتی ہے۔

اس اندازِ تنقید اور اسلوب کو اپنے مقاصد میں شامل کرنا اور مسلسل اس طرح کے مضامین شائع کرنا، یہ اسلامی خدمت کے علمبردار دانشور اہلِ قلم کے شایانِ شان نہیں۔ ہندوستان میں ایک ممتاز فاضل شخصیت طویل عرصہ سے اس طرح کا تنقیدی ''فریضہ'' سرانجام دے رہی ہے۔ اگر اسلامی فکر کے بنیادی اجزاء صحیح ہیں تو فکر کی جزوی کمزوریاں ایسی ہیں، جو فاضل شخصیتوں کی مجموعی اسلامی خدمات کے پیشِ نظر اس بات کی مستحق ہیں کہ انہیں نظر انداز کیا جائے۔ اگر معاشرہ میں اپنی ذاتی محنتوں سے وسیع مطالعہ کرکے، مسند علم پر فائز ہر دانشور ساری فاضل اسلامی شخصیتوں کے فکر کو متنازعہ بنانے کی راہ پر گامزن ہو تو اس سے معاشرہ میں جو بے اعتمادی اور بداعتمادی پیدا ہوسکتی ہے، وہ ظاہر وباہر ہے۔

جیسا کہ اس عاجز نے اس سے پہلے خطوط میں درد دل کے ساتھ عرض کیا تھا کہ علم وفضل کی مسند پر فائز ہوکر تشریح اسلام کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے محض ظاہری علم کافی نہیں۔ اس کے لئے تزکیہ بھی ضروری ہے۔ قرآن نے تزکیہ کا ذکر علم سے الگ کیا ہے۔ تزکیہ سے محروم اہلِ کتاب کے عالموں کے علم کو قرآن نے گدھے پر لدے ہوئے کتابی علم سے تشبیہ دی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ سے بے بہرہ علم یا معرفت نفس اور معرفت رب سے خالی علم (جو موجودہ دور کے اہلِ علم کا خاصہ ہے) افراد کو غیر متوازن بنادیتا ہے اور ان کے فہم میں نقص پیدا کردیتا ہے اور حقیقی بصیرت کی راہ میں حائل ہوجاتا ہے۔ احادیث میں ایسے علم کو، جو اللہ کی رضا جوئی کے مقصد سے خالی ہو، اس پر سخت تنبیہیں آئی ہیں۔ چونکہ آج کل تقریبا ہم سب کا علم اسی نوعیت کا ہے۔ اس لئے یہاں اس طرح کی دوتین احادیث نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

''حضرت ابنِ عمر سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جس نے علم کو غیرخدا کے لئے حاصل کیا یا جس نے علم کے ذریعہ غیر خدا کی رضا جوئی کا ارادہ کیا تو اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تلاش کرے (ترمذی شریف) حضرت ابوہریرۃ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جس نے علم اس غرض سے حاصل کیا کہ اہلِ علم کے درمیان فخر وعزت حاصل کرے اور بے علموں کا ناطقہ بند کرے اور لوگوں میں نام ونمود حاصل کرے تو اسے اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کرے گا۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرح کے علم سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

جب علم کے ساتھ تزکیہ ہوتا ہے اور علم کے ساتھ معرفت حاصل ہوتی ہے، تو ایسا علم افرادِ معاشرہ کو توڑنے کی بجائے جوڑنے کا کارنامہ سرانجام دیتا ہے۔ ایسے علم کے حامل دانشوروں کی تنقید بھی جذبہ محبت وجذبہ دردمندی سے خالی نہیں ہوتی۔ ان کی تنقید سے بھی حقائق تک رسائی میں مدد ملتی ہے اور وہ بظاہر تنقید ہوتی ہے، لیکن بباطن انکشافِ حقائق اور فروغ بصیرت کا ذریعہ ہوتی ہے۔

ہمارے بزرگان، جتنا وقت علم میں صرف فرماتے تھے۔ اس سے زائد وقت تزکیہ اور تقویٰ کے حصول اور ایمان ویقین کے استحکام اور باطنی امراض کے ازالہ کے لئے مجاہدوں میں صرف فرماتے تھے۔ تزکیہ کے لئے ان کے ان مجاہدوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے اسلاف کی تحریروں اور ان کے علوم میں انسانیت کا پورا جوہر موجود ہے۔ ہم جو وقت علم ومطالعہ میں صرف کرتے ہیں، اگر اس کا دسواں حصہ بھی تزکیہ کے حصول اور یقین کی کیفیات کے استحکام کے لئے صرف کریں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا علم بھی معاشرہ کو جوڑنے، وحدت امت کو فروغ دینے اور انکشاف حقائق کے فروغ کا ذریعہ بنے گا۔

جدید علمِ نفسیات کا یہ نکتہ انتہائی اہم ہے کہ فرد کہتا ہے کہ میری عقل یہ کہتی ہے یا فلاں مسئلہ میں میری رائے یہ ہے، دراصل یہ عقل نہیں ہوتی، بلکہ عام طور پر یہ نفس کی تاویلی صورت ہوتی ہے، جو عقل کی رائے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ خواہشات نفس (نفس کی قوت) عقل کو یرغمال بنا کر اس سے جو فیصلے صادر فرماتی ہے، وہ فیصلے یرغمال شدہ عقل ہی کے ہوتے ہیں اور آزاد اور عقل سلیم کے فیصلہ نہیں ہوتے۔ عقل سلیم کی حالت تو نفس امارہ کے بعد نفس مطمئنہ کے پہلے مرحلہ میں داخل ہونے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرد کو جتنا علم حاصل ہوتا جاتا ہے، نفس مطمئنہ اس علم کو بصیرت وبصارت کی روشنی میں پرکھ کر، عقل سلیم کے حوالہ کردیتی ہے، عقلِ سلیم اس علم کے ذریعہ معاشرہ میں سراپا روشنی ہی بکھیرتا رہتا ہے۔

آپ کا ایک بڑا مغالطہ جس کی وجہ سے آپ سارے جدید اسلامی فاضلوں کی فکر کی تردید پر آمادہ ہوئے ہیں، وہ یہ ہے کہ سائنس کو مغرب کی مادہ پرست تہذیب اور اس کی فکر سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس خالص مادہ پرست تہذیب کا حصہ ہے۔ مادہ پرست تہذیب اور فکر کے کچھ اجزاء کو لے کر اسلام کے ساتھ منسلک نہیں کیا جا سکتا، نیز اقبال، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، مولانا علی میاں اور دوسرے سارے اسلامی فاضل سائنس کو اسلامی مقاصد کے لئے استعمال کرنے اور سائنسی تحقیق سے اسلام کی صداقت کا جو کام لے رہے ہیں، یہ ان کی سادگی وسادہ لوحی ہے اور جدید فکر وتہذیب کی گہرائیوں سے ناواقفیت ہے۔ چونکہ سائنس، مادہ پرست تہذیب کی بنیاد میں شامل ہے، اس لئے اسے اسلامائیز نہیں کیا جا سکتا۔

اس مسئلہ پر تفصیلی بحث سے خط لمبا ہوجائے گا، کبھی موقعہ ملا تو انشاء اللہ اس

کے سارے پہلوؤں پر تفصیلی خط لکھوں گا۔ یہاں مختصرا کچھ نکات عرض کرتا ہوں۔ یہ کہنا یقیناً غلط ہوگا کہ عقلی اور نفسیاتی علوم، جدید مادہ پرست تہذیب اور اس کے علمبرداروں کا ورثہ ہیں، اس لئے کہ عقلی علوم اور نفسیاتی علوم مسلمانوں میں صدیوں سے رہے ہیں اور انہوں نے ان علوم میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں، تصوف تو سراپا نفسیاتی علوم وواردات پر مشتمل ہے۔ البتہ یہ بجا ہے کہ پچھلے دوتین سو سال سے عقلی اور نفسیاتی علوم کو مغرب نے اختیار کرکے، انہیں اپنی مادہ پرست تہذیب کا حصہ بنا لیا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ علوم انہیں کا ورثہ ہیں اور ان علوم کو ان کے تصرف سے نکال کر اسلامی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا، جب کہ یہ علوم کسی بھی طور پر مادیت سے میل نہیں کھاتے، بلکہ ان علوم کا آخری نتیجہ کائنات میں وحدت کے نظام تک رسائی ہے۔ انسانی شخصیت میں موجود وحدت کا نظم بھی واحد ذات کی شاہدی کا ذریعہ ہے۔

یہ بجا ہے کہ سائنسی علوم میں مغرب نے خدا فراموشی کے زہر کو اس طرح شامل کرلیا ہے کہ ان علوم سے لادینیت کے زہر کو جدا کرنا انتہائی مشکل ہے اور موجودہ سارے سائنسی علوم، افراد کو مادہ پرست بنانے اور مزاج میں سیکولرزم کے رنگ کو غالب کرنے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ لیکن سائنس بذاتِ خود تو مادہ پرست ہے نہیں، وہ تو ایک فن اور ٹیکنالوجی ہے، بلکہ ایسی ٹیکنالوجی ہے، جو معرفتِ خداوندی کا اہم ذریعہ ہے۔ سائنسی تحقیق جتنی بھی ہوتی جائے گی، اس کے نتیجہ میں خداپرستی کے اثرات ظاہر ہوئے بغیر رہ نہیں سکیں گے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے بہت سارے سائنسدان قدرت کے وسیع نظام کے مشاہدہ کے وجہ سے کانپ اٹھے ہیں اور خشیت الٰہی سے ان کے جسموں میں لرزہ پیدا ہوا ہے۔ یہ تو سائنس کی اس وقت کی حالت ہے، جب مادہ پرست تہذیب کے علمبرداروں نے اسے مکمل طور پر اپنے مادہ پرستی کے اغراض کے لئے استعمال کیا ہے۔ جب ان سائنسی علوم کو ایک باضابطہ منصوبہ بندی کے تحت خدا کی معرفت کے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا تو اس کے جو نتائج ظاہر ہوں گے، کیا وہ نتائج وہی نہیں ہوں گے، جس کا انکشاف قرآن نے درج ذیل آیت میں چودہ سوسال پہلے کردیا ہے، **سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ** (عنقریب ہم ان کو انسانی نفس کے اندر اور خارج کی دنیا میں اپنے نشانات دکھائیں گے، حتیٰ کہ ان پر ثابت ہوجائے گا کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے)۔

معرفت رب جو اسلام کے مقاصد میں شامل ہیں۔ یہ معرفت رب ایک تو مخلصانہ طور پر عبادت اور ذکر وفکر سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا ذریعہ سیر وسفر اور کائنات کا مطالعہ ومشاہدہ بھی ہے۔ اس لئے صوفیائے کرام کے ہاں ہمیں یہ روایت ملتی ہے کہ وہ منتہی سالکوں کو سیروسفر کی تلقین کرتے تھے، تاکہ قدرت کی نشانیوں اور عجائب وغرائب کے مشاہدہ سے عبرت حاصل ہو۔ سائنس بھی دراصل معرفت رب ہی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اس لئے قرآن میں **إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ** جیسی متعدد آیات میں اس پر زور دیا گیا ہے۔

آپ کی تحریروں سے لگتا ہے کہ آپ اسلامی فکر کے بارے میں اور اسلامی فاضلوں کے تجزیاتی مطالعہ کے سلسلہ میں مغربی دانشوروں کی تحریروں پر زیادہ انحصار فرماتے ہیں اور مغربی دانشوروں نے جو بات کہدی، اسے آپ پتھر کی لکیر تصور کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اقبال نے خودی کا فلسفہ تین مغربی فلاسفروں، جیمس وارڈ، ولیمز جی سورلے اور جان ملیگرٹ سے لیا ہے۔ اسی طرح آپ فرماتے ہیں کہ ایک فرانس کے دانشور کا کہنا ہے کہ فقہ التفسیر دس بارہ جلدوں پر مشتمل فقہ عمر احمد عثمانی کی لکھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ طاہر مکی صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔'' یہ مولانا عمر احمد عثمانی (مولانا ظفر احمد عثمانی کے فرزند) کی صلاحیتوں سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ویسے بھی کوئی شخص اپنا معمولی مضمون بھی کسی دوسرے کے نام سے شائع کرانا گوارا نہیں کرتا۔ ہزاروں صفحات کی اعلیٰ درجہ کی تحقیقی کتاب، جس میں موصوف کی زندگی کی بیشتر توانائیاں صرف ہوئی ہیں، اتنی عرق ریزی سے لکھی ہوئی کتاب دوسروں کے نام منسوب کرنا سمجھ سے باہر ہے۔ مولانا عمر احمد عثمانی نے کتاب کے مقدمہ میں ساری تفصیلات بیان کردی ہے، اس پر اعتماد نہ کرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

علامہ یوسف القرضاوی کی شخصیت او ان کی فکر کے بارے میں مغربی دانشوروں نے جو کچھ لکھا ہے۔ آپ کو ان کی صحت پر پورا یقین ہے۔ اس لئے آپ کی نظر میں علامہ یوسف القرضاوی جدید دور کے تجدد پسندوں کی بُری مثال ہیں۔ آپ اگر علامہ

یوسف القرضاوی کو اہلِ مغرب کی آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے ان کی درجنوں کتابیں پڑھتے تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ موصوف کے بارے میں فرنگی دانشوروں کی رائے گمراہی پر مشتمل ہے، بلکہ وہ حقیقت میں اسلام اور عالمِ اسلام کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کا پچاس سالہ کردار ان کی خدماتِ اسلام سے اتنا سرشار ہے کہ ان کے بارے میں کوئی بھی اہلِ علم یہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ وہ تجدد پسندی کے علمبردار ہیں۔

اقبال کے خودی کے فلسفہ کے بارے میں، جو آپ کی تحقیق کے مطابق مغربی فلاسفروں سے ماخوذ ہے۔ اگر آپ فکر اقبال کا گہرا مطالعہ فرماتے تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ خودی کے فلسفہ میں اسلامیت کی جو گہرائی وگیرائی شامل ہے، اس طرح کے عظیم الشان فلسفہ تک مغربی فلاسفروں کے ذہن کی رسائی کہاں ہوسکتی ہے۔

آپ نے اقبال کے خودی کے فلسفہ پر اپنی سادگی کی وجہ سے اعتراضات کردیئے ہیں۔ حالانکہ خودی کے فلسفہ کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان کی اصل شخصیت اور اس کی اصل ہستی، فطرتا خالقِ کائنات کے ساتھ تعلق کے ایک ایسے رشتہ میں منسلک ہے کہ یہ خودی، خودیٔ مطلق ہستی کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ اس خودی کی غذا دردِ عشق ومحبت کے ذریعہ خودیٔ مطلق سے وصال ہے۔ وصال کی یہ صورت اسلامی تعلیمات پر مکمل عمل پیرا ہونے اور مخلصانہ عبادت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اقبال نے خودی کے تصور کو وسعت دے کر سارے اسلامی فکر کو اس میں سمویا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے آپ اگر ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کتاب ''حکمتِ اقبال'' کا مطالعہ فرمائیں تو آپ فلسفہ خودی کی ایسی حکمت سے آشنا ہوجائیں گے کہ ان شاء اللہ فکر اقبال کی اہمیت پوری گہرائیوں کے ساتھ پہلی بار آپ پر واضح ہوگی۔

اسلامی فکر یا اسلامی فاضلوں کی فکر کے فہم کے سلسلہ میں مستشرقین کی کتابوں پر انحصار کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ برصغیر ہند میں فتنہ انکارِ حدیث کو جو فروغ ملا ہے، وہ مستشرقین کی کتابوں ہی سے تو ملا ہے۔ علامہ اسلم جیراجپوری نے مستشرقین کی عربی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کیا، جس سے موصوف کا احادیث پر اعتماد مجروح ہوا اور وہ منکرِ حدیث ہوئے۔ انہوں نے یہی زہر اپنے شاگرد غلام احمد پرویز میں منتقل کیا، پرویز نے اپنی غیرمعمولی علمی وقلمی صلاحیتوں سے اس فتنہ کو فروغ دیا۔ آپ مولانا محمد تقی عثمانی، مولانا رفیع عثمانی کے صاحبزادے ڈاکٹر زبیر اشرف عثمانی اور مفتی اعظم کے بھتیجے عمران اشرف عثمانی کے بارے میں لکھتے ہیں: یہ تینوں حضرات مغربی فلسفہ سے قطعا ناواقف ہیں، لیکن انہوں نے مغرب کے علم معاشیات کے کافرانہ خیالات کو اسلامائز کر لیا ہے اور سودی نظام کو غلط فہمی کی بنیاد پر غیر سودی نظام سمجھ لیا ہے۔''

آپ نے حضرت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کو بھی جدیدیت کے اثرات کا حامل قرار دیا ہے۔

شاہ ولی اللہ کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں: تیسری روایت جو مصر اور پاکستان میں دوطریقے سے سامنے آئی، پاکستان میں مودودی کی سیاست، مفتی تقی عثمانی کی معیشت جس نے سود کو اسلامی جواز عطا کیا، ڈاکٹر اسرار احمد کا علم الکلام جس کے مطابق پورا مغرب مسلمان ہوچکا ہے۔ صرف کلمہ پڑھنے کی کمی رہ گئی ہے۔ طاہر القادری جو تقی عثمانی کی طرح سود کی تاویل کرنے کی بجائے اور اسے اسلامی رنگ دینے کی بجائے، تجارتی سود کو حلال قرار دیتے ہیں۔''

افسوس یہ ہے کہ آپ کی تنقید کی زد سے بڑے سے بڑا اسلامی فاضل بھی محفوظ نہ رہ سکا ہے۔ آپ جس مسند پر بیٹھ کر سب کی اسلامیت کو مشکوک بنانے اور اپنی طرف سے تشریح اسلام کا ''کارنامہ'' سرانجام دے رہے ہیں، اسے دانشوری نہیں کہتے، بلکہ مجتہدانہ مقام کہتے ہیں۔ اس مجتہدانہ مقام پر فائز ہونے کے لئے اسلاف نے جو شرائط مقرر کی ہیں۔ آپ کو دیکھنا چاہئے کہ ان شرائط کو پورا کرنے کے لئے اسلامی علوم کی تکمیل کی خاطر علماء سے کس حد تک اخذِ فیض کیا ہے، پھر اس کے لئے تقویٰ کی بھی اہم شرط ہے۔ اس طرح کی کئی شرائط ہیں۔ فرنگی دانشوروں کی کتابوں کے مطالعہ اور اپنی تاریخ کے مطالعہ سے تو مجتہدانہ منصب حاصل نہیں ہوتا۔

فکرِ اسلامی کی پیشکش کے سلسلہ میں یا علمی و دعوتی اہداف اور حکمتِ عملی کے معاملہ میں ہم سب کے لئے سلامتی کی راہ یہ ہے کہ ان معاملات میں ہم عقلِ محض سے کام لینے اور اپنے ذاتی مطالعہ ومشاہدہ پر انحصار کرنے کی بجائے اپنے دور کے علمائے ربانی کی فکر اور طریق حکمت سے اخذ فیض کریں اور ان کی اقتدا کو قبول کرکے،

اپنی علمی صلاحیتوں کے ذریعہ خدمتِ اسلام کا فریضہ سرانجام دیں۔ مثلا اس دور کے علمائے ربانی میں (جو افکارِ حاضرہ سے بھی بڑی حد تک آشنا تھے) مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا علی میاں جیسی شخصیتیں شامل ہیں۔ اہم معاملات میں اپنے دور کے علمائے ربانی سے اختلاف کرکے، بلکہ ان سے جداگانہ راہ اختیار کرکے کام کیا گیا تو اس طرح کے کام کا وہی حشر ہوگا، جواب تک ہوا ہے کہ امت میں عقل محض کے استعمال کی وجہ سے نئے نئے دبستان فکر وجود میں آتے رہیں گے، جو اپنے علاوہ سب کی تغلیط میں اپنی صلاحیتیں صرف کریں گے۔ راقم کی نظر میں یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ جسے نظر انداز کرنا عقل کو اغوائے نفس کے حوالہ کرنے کے مترادف ہے۔

تنقید میں اگر کہیں سختی ہوگئی ہے تو میں آپ سے معافی چاہوں گا۔ لیکن تنقید کا مقصود جذبہ اصلاح کے سوا کچھ بھی نہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

مولانا نور اللہ رشیدی صاحب

مولانا نور اللہ رشیدی صاحب، سہراب گوٹھ کراچی کی ایک جامع مسجد میں خطیب ہیں۔ مسجد سے متصل مدرسہ بھی ہے، جس کے موصوف ذمہ دار ہیں۔ عمر زیادہ نہیں، ۳۳ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ مختلف سلسلوں کے چار پانچ بزرگوں سے خلافت ملی ہے۔ دور جدید کے مفکروں کے فکر کے مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں اور بڑھتے ہوئے جدید مادی فکر کے مقابلہ کے لئے فکرمند رہتے ہیں، کافی متحرک اور مضطرب شخصیت ہیں، اس عاجز کے ساتھ محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ اس عاجز کی لگ بھگ ساری کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ ان کی فکر مندی کو دیکھتے ہوئے جدیدیت کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں انہیں یہ خط لکھا گیا ہے۔

۱۰دسمبر۲۰۱۲ء

محترم جناب گرامی قدر مولانا نور اللہ رشیدی صاحب

السلام علیکم: مزاج شریف

آپ کی محبت کے لئے مشکور ہوں۔

آپ نے فرمایا ہے کہ میں علماء کرام میں جدیدیت کے چیلنج کو سمجھنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے محاذ پر کام کرنا چاہتا ہوں، آپ کے لٹریچر سے مجھے اس سلسلہ میں کافی مواد ملا ہے اور حوصلہ بھی ملا ہے کہ اس محاذ پر کام کیا جائے، اس سلسلہ میں آپ کے لئے کچھ نکات متعین کروں کہ جدیدیت کیا ہے اور علماء کے محاذ پر اس کا مقابلہ کیسے ہو؟ آپ نے مختلف مواقع پر اس خواہش کا اظہار کیا ہے، آپ کے جذبہ کو دیکھکر اس سلسلہ میں کچھ باتیں پیش خدمت ہیں۔

جدیدیت وسیکولرزم دراصل انسان، کائنات اور زندگی کے مسائل ومعاملات کے بارے میں مذہب، وحی اور خدا کی رہنمائی کو مکمل طور پر مسترد کرکے، عقل محض کے

ذریعہ ان سارے مسائل کو سلجھانے کا ذریعہ ہے۔ جدیدیت کے سارے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان ترقی یافتہ حیوان ہے، اس کی ضروریات حیوان سے مختلف نہیں۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ حیوان کی عقل ترقی یافتہ نہیں ہے، جب کہ انسان کی عقل ترقی یافتہ ہے۔ حیوان کی ضروریات محدود ہیں، جب کہ انسان کی ضروریات زیادہ ہیں۔

انسان کو اپنی ان جبلی اور حیوانی ضروریات کی تکمیل کے لئے کسی خدا، وحی، مذہب اور نبی وغیرہ کی کوئی ضرورت درپیش نہیں، انسان کے عقل میں یہ صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ وہ مادی زندگی اور مادی مسائل کو سوچ بچار کے ذریعہ حل کر سکے۔

جدیدیت کا یہ نقطہ نگاہ ایسا ہے، جس پر گذشتہ تین سو سال میں ہزارہا مغربی مفکروں، فلاسفروں، محققوں اور ماہروں نے کتابیں لکھی ہیں اور مغرب کا سارا اجتماعی، معاشرتی، تعلیمی، معاشی اور عملی نظام اسی جدیدیت پر استوار ہے اور اس نظام میں خدا، مذہب اور دین کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ البتہ جدیدیت نے لوگوں کو اس بات کی ضرور اجازت دی ہے کہ اگر وہ انسان کے اندر میں موجود روح کے نام سے کسی چیز کے قائل ہیں تو اس روح کی تسکین کے لئے وہ انفرادی طور پر وردوظائف کا عمل کر سکتے ہیں۔ محدود پیمانے پر ان کی عبادت کی راہ میں کوئی قدغن ہیں۔ اسی طرح اگر وہ خدا کو ماننا چاہتے ہیں اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں تو انہیں اس کی اجازت ہے کہ وہ ایسا کرسکتے ہیں۔ اگرچہ خدا وآخرت کا تصور فرضی چیزیں ہیں، لیکن انفرادی زندگی میں افراد کو اس طرح کا عقیدہ رکھنے کا حق حاصل ہے۔ جب کہ سیاست۔ معیشت، معاشرت، تعلیم، انتظامیہ اور زندگی کے سارے معاملات میں خدا، مذہب اور وحی کے عقائد وتعلیمات کو مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں۔ قانونی طور پر اس کی اجازت نہیں، ریاستوں کا سارا نظام سیکولرزم کی بنیاد پر ہی متشکل ہوگا۔

سیکولرزم کا یہ نظریہ مغربی فکر پر غالب ہے اور مغربی تہذیب اسی فکر کی نمائندہ تہذیب ہے۔

سیکولرزم کے پس منظر میں مغرب میں جو نظریات فروغ پذیر ہوئے، اس کا ذکر ہم نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ سیکولرزم کی خطرناکی اور زہرناکی کو سمجھنے کے لئے یہ تفصیلی حوالہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

''مغرب کے جس فکر نے ہماری ذہین نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ اس کے کچھ نکات یہ ہیں۔

(۱) خدا اور مذہب کا تصور سائنسی اور دنیاوی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مغرب کی ترقی خدا اور مذہب کو چھوڑنے کے بعد ہوئی ہے۔

(۲) اس دور کا سب سے مقبول نظریہ سیکولرزم ہے۔ جس کے مطابق ریاست کا پورا اجتماعی نظام، معاشرتی، معاشی اور ریاستی نظام عقلیت کا مرہون منت ہے۔ خدا اور مذہب کا دنیا کے اس کاروبار سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ سیکولرزم، روشن خیالی اور ترقی کے دور میں داخل ہونے کا نام ہے۔ زندگی، کائنات، انسانی تخلیق اور زندگی کے مسائل کے بارے میں سیکولر فکر کی کئی ایسی جہتیں ہیں۔ جنہوں نے انسانی تہذیب کو خداپرستی کے تصور سے ہٹاکر خالص مادہ پرستی کی طرف دھکیلا ہے۔ ان میں ایک ڈارون کا نظریہ ارتقا ہے، اس کے مطابق انسان کا ارتقا سمندر کے نزدیک پیدا ہونے والے کیڑوں سے شروع ہوا ہے۔ اس کا درمیانی مظہر باندر ہیں۔ باندر سے ترقی کرکے، اس نے انسان کی موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ دوسرا فرائیڈا کا نظریہ ہے کہ انسانی نفسیات کی طاقتور محرک اس کے جنسی جذبات وخواہشات ہیں۔ یہ خواہشات اتنی طاقتور ہیں کہ وہی افراد کی ساری زندگی اور ان کی جملہ سرگرمیوں کا رخ متعین کرتے ہیں۔ اس لئے جنسی جذبہ کی تسکین پر اخلاقی پابندیاں عائد کرنا غلط ہیں، ورنہ انسانی معاشرہ بیمار معاشرہ میں تبدیل ہوجائے گا۔

سیکولر فکر کا تیسرا پھل میکڈوگل کا نظریہ ہے، جس کے مطابق انسان میں حیوانی خواہشات اور حیوانی جذبات کے سوا دوسرا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے۔ روح یا روحانیت کے نام سے انسان میں کوئی قوت موجود نہیں ہے، انسان کی زندگی کا مقصد ترقی یافتہ حیوان کی مانند مادی خواہشات کو پورا کرنا ہے۔

سیکولر فکر کا چوتھا پھل ایڈلر کا نظریہ ہے، جس کے مطابق انسان میں سب سے زیادہ طاقتور جذبہ دوسروں کو گراکر کر اور انہیں ذلیل کرکے، ان پر برتری حاصل کرنا ہے۔نکیر انسانی زندگی میں مادی طور پر مسابقت کا جذبہ اپنی بالادستی قائم کرنے والی سرگرمیوں پر مشتمل ہے اور یہی داعیہ انسان کا سب سے طاقتور نصب العینی داعیہ ہے۔

سیکولر فکر کا پانچواں پھل مارکسزم کا نظریہ مادیت ہے، جس کے مطابق مذہب، تہذیب، کلچر، اخلاق وغیرہ یہ سب سرمایہ داروں کی ایجاد کردہ چیزیں ہیں۔ انسان کا سب سے طاقتور نصب العینی جذبہ، جس کے لئے اس کی ساری جدوجہد ہوتی ہے، وہ معاش ہی ہے۔

الغرض یہ کہ سیکولر فکر کے یہ سارے پھل ایسے ہیں، جنہوں نے انسانی زندگی کو زہریلا بنا دیا ہے۔ مغرب میں سیاسی، اجتماعی اور تعلیمی نظام اور زندگی کا سارا نقشہ سیکولرزم کے رجحانات کے مطابق ہی ترتیب دیا گیا ہے۔ اگرچہ ڈارون کا نظریۂ ارتقا، سائنسی تحقیق کی رو سے مسترد ہو چکا ہے، لیکن مغرب کا ملحدانہ ذہن اس سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کے سیاسی اثرات ونتائج تو اپنی جگہ پر جوں کے توں موجود ہیں۔''

مغرب کو فوجی، سائنسی، ٹیکنالوجی اور معاشی طور پر جو بالادستی حاصل ہوئی اور جدید آلات نے دل اور ذہن کو تبدیل کرنے میں جو کامیابی حاصل کر لی ہے، اس کی وجہ سے یہ فکر مغرب سے نکل کر، عالم اسلام تک پھیلی چکی ہے اور عالم اسلام کی جدید پڑھی لکھی آبادی کچھ شعوری اور کچھ غیرشعوری طور پر بڑی طرح سیکولرزم کی اس فکر سے متاثر ہے۔

سیکولرزم کا سب سے بڑا ہتھیار مادی زندگی کی رونق، اس کا بہتر مستقبل، شاندار مکانات، جدید قسم کی بہترین گاڑیاں، بنک بیلنس اور اپنی ساری توانائیں ان مادی چیزوں کے حصول کے مقصد میں صرف کرنے کا ہتھیار ہے۔ چنانچہ مسلم دنیا کے لگ بھگ ہر ذہین اور باصلاحیت فرد کا نصب العین بہتر سے بہتر مادی وسائل کا حصول بن کر رہ گیا ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ صبح اٹھتے ہی تیار ہوکر، دفتر یا کارخانے یا کاروبار جاتے ہیں اور رات گئے تک مادی ترقی کے جنوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر کسی حد تک مذہبی شعائر موجود بھی ہیں تو ان کی حیثیت رسمی نوعیت سے زیادہ نہیں۔

سیکولر فکر کی عالمی سطح سے لے کر ریاستوں اور اداروں کی سطح تک ہمہ گیریت نے ایک تو جدید مسلمانوں کے فکر ونظر کو بڑی طرح متاثر کیا اور ذہنوں کو تبدیل کر دیا، دوسری طرف اس نے زندگی کے رخ کو روحانیت سے مادیت کی طرف اور آخرت سے دنیا کے بہتر مستقبل کی طرف موڑ دیا۔

اس سلسلہ میں میں پھر اپنی ایک تحریر سے مدد لینا چاہوں گا، تاکہ مسئلہ کی پوری طرح توضیح ہوسکے۔

''جدید مادی نظریات نے سارے مذاہب کے لئے خطرات پیدا کردیئے ہیں۔ چونکہ ان نظریات پر مشتمل طاقتور ریاستیں اور ادارے قائم ہیں اور دنیا کی بیشتر علمی اور تحقیقی سرگرمیاں انہی نظریات کے فروغ وپھیلاؤ کے لئے ہورہی ہیں، اس لئے مغربی دنیا میں تو مذاہب پر اعتماد ختم ہوا ہی ہے یا مذہب کا دائرہ چند مراسم کی ادائگی تک محدود ہوا ہے۔ لیکن مسلم دنیا میں بھی تعلیمی اداروں، کتابوں کی نشرواشاعت اور ابلاغ کے جدید ذرائع اور الیکٹرانک میڈیا سے یہ نظریات تیزی سے پھیل رہے ہیں اور ذہنوں میں شعوری یا غیرشعوری طور پر انسان اور کائنات کے مادی نقطہ نظر کے اثرات بڑھ رہے ہیں اور حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے ذریعہ ہرسال ایسے لاکھوں افراد تیار ہوکر نکلتے ہیں جو جدید نظریات اور جدید تہذیب کے زیر اثر بڑی حد تک ایمان ویقین سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ خدا کا منکر ہے، دوسرا طبقہ آخرت کا انکاری ہے، تیسرا گروہ دور جدید میں اسلامی تعلیمات کو ناقابل عمل سمجھتا ہے اور اسلامی ریاست کے تصور کو فضول سمجھتا ہے۔ ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے، جو خالص مادہ پرست ہے۔ ایسے افراد تو قابل ذکر تعداد میں ہیں، جنہیں اسلام کی عائد کی ہوئی پابندیوں پر اعتراض ہے۔ مثلا: جنسی تعلقات پر اسلام کی پابندیاں پسند نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ پابندیاں فطری حیاتیاتی عمل کی راہ میں غلط رکاوٹ ہیں۔ اس سے صحت خراب ہوتی ہے، اس لئے کہ جب جنسی خواہش کی جائز و ناجز طریقے سے بروقت تسکین نہ ہوگی تو صحت متاثر ہوگی۔ یہ لوگ اسلام کی عبادت کے طریقوں کو بھی بے معنیٰ سمجھتے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ حج اور قربانی کو لایعنی عمل سمجھتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو اسلام کے اساسیات کا انکار کرتے ہیں اور اس کے بنیادی اصولوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ غیراسلامی تصورات اور جدید کفر کی راہ پر گامزن ہونے کے باوجود اسلام کا نام لیتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسی راہ اختیار کرچکے ہیں جو اسلام سے جداگانہ راہ ہے۔

نظریاتی ارتداد کی یہ زبردست تحریک مسلم معاشرے میں جس انداز سے بڑھ رہی ہے، بدقسمتی سے اہل مذہب کو اس کا شعور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ

اس تحریک کی روک تھام کے لئے نہ کوئی پلاننگ ہے اور نہ فکر وتشویش۔ اس تحریک کے بڑھتے ہوئے اثرات کے شعور نہ ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ ارتداد کی جدید تحریک، ارتداد کی سابقہ تحریکوں کے مقابلہ میں بالکل نئی نوعیت کی ہے۔ پہلے باطل مذہب، براہ راست اسلام کے مقابلہ پر آتا تھا، لیکن اب یہ نظریاتی تحریک علم وعقل کے نام پر حملہ آور ہوئی ہے اور اس کا لباس فلسفیانہ نوعیت کا ہے۔ اب اس کا نشانہ، براہ راست اسلام نہیں ہے، بلکہ علمی تحقیق اور عقلی استدلال کے نام پر انسان وکائنات کی ایسی تشریح پرزور ہے، جس میں خدا ورسالت اور اسلام کی کوئی گنجائش موجود نہ ہو اور یہ مادی نظریہ ذہنوں پر اس طرح چھا جائے کہ اس کے مقابلے میں پاکیزہ نظریے کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے۔ اس نظریے سے متاثر ہونے کے نتیجہ میں مذہبی اعتقادات اور اسلامی شریعت سے ازخود بغاوت، دوری، اجنبیت اور عدم اعتماد کی فضا پیدا ہوجاتی ہے اور ایسا ذہنی اور نفسیاتی ڈھانچہ تیار ہوجاتا ہے کہ افراد، مذہبی اعتقادات اور اسلامی شریعت کے حوالے سے شدید ذہنی الجھنوں اور اشکالات کا شکار ہوجاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرستی کے جدید نظریات نے اسلام کے لئے ایک ایسا خطرہ عظیم پیدا کردیا ہے، جس کی مثال اسلام کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ مزید تشویش کی بات یہ ہے کہ مسلم دنیا کے مذہبی اور علمی حلقوں کو ان نظریات کی خطرناکی کا علم ہی نہیں۔ انگریز کے دور حکمرانی میں جب عیسائیت اور آریہ دھرم، اسلام کے لئے چیلنج بن کر سامنے آیا تھا تو اس وقت مسلمان علماء وفضلاء نے کتابوں، رسالوں، اخباروں، وعظ ونصیحت اور مناظروں کے ذریعے عیسائی مشنریوں اور دیانندی ہندوؤں کی کوشش کو اس طرح ناکام بنا دیا تھا کہ انہیں پسپائی اختیار کرنی پڑی تھی اور آریہ دھرم اور عیسائیت کی رد اور اسلام کی صداقت کے لئے عظیم لٹریچر وجود میں آگیا تھا، لیکن اس وقت صورتحال اس سے مختلف ہے۔ چنانچہ مذہبی اور مسلکی دائرے میں تو خدمت اسلام کا کام ہورہا ہے، اس کے لئے مساجد، مدارس اور درس وتدریس اور وعظ ونصیحت کا سلسلہ جاری ہے، لیکن جدید علم، تحقیق اور سائنٹفک حقائق کے نام پر نظریاتی ارتداد کی جو ہم گیر تحریک عالمی سطح سے شروع ہے، اس کے مقابلہ کی فکر نہیں۔ اس کا ایک سبب تو وہ ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا، دوسرا ہم سبب یہ ہے کہ پہلے باطل مذہب کے زیر اثر جب کوئی مسلمان، دوسرا مذہب اختیار کرتا تھا تو اسے گرجا یا مندر جاکر شدھی یا بپتسمہ کی ایک رسمی کارروائی سے گذرنا پڑتا تھا، اس کے بعد وہ مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوجاتا تھا اور مسلمانوں سے اس کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی رابطے یکسر ختم ہوجاتے تھے اور وہ شادی بیاہ اور میل وملاقات اور سماجی تعلقات کے لئے دوسری قوم سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔ جس سے اس کی اسلام سے بغاوت ظاہر ہوجاتی تھی اور مسلمان ان کی طرف سے اسلام کو نقصان پہنچانے کی متوقع کوششوں سے ہوشیار ہوجاتے تھے۔ لیکن جدید تہذیبی اور نظریاتی یلغار اور جدید باطل فلسفہ کے زیر اثر وجود میں آنے والے نظریات کی ''خاصیت'' یہ ہے کہ ان ارتدادی نظریات کو قبول کرنے والے افراد باطل مذاہب کی طرح رسمی کاروائیوں سے نہیں گذرتے۔ نیز انہیں مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہونے، اس سے سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات ختم کرنے اور نئی قوم سے شادی بیاہ اور روابط قائم رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جدید باطل نظریات کی طرف سے ارتداد اختیار کرنے والے افراد کو اس بات کی پوری اجازت حاصل ہے کہ تم مسلم معاشرے کا حصہ بن کر رہو۔ ان سے سارے مالی اور سماجی فوائد حاصل کرتے رہو۔ ناموں کو بدلنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس طرح مسلم معاشرے میں رہ کر اپنائیت کے احساس کے ساتھ مسلم افراد میں علم وعلمی تحقیق کے نام پر ارتدادی نظریاتی تحریک کو پھیلاتے رہو۔ یعنی جدید باطل رسمی مراحل سے گذارے بغیر افراد کے فکر ونظر کو تبدیل کردیتا ہے۔''

اس طویل حوالہ سے بات بڑی حد تک واضح ہوگئی۔

ان حالات میں علمائے کرام میں کرنے کا ایک اہم کام یہ ہے کہ انہیں جدیدیت اور سیکولرزم کی ان زہرناکیوں سے آشنا کیا جائے اور ان میں اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کا شعور وادراک پیدا کیا جائے، یہ ایسا کام ہے، جو اگرچہ ملک کے بڑے بڑے مدارس کے زعماء کو کرنا چاہئے تھا، لیکن اگر ان کی مصروفیات اس کام کی راہ میں حائل ہیں تو آپ جیسی شخصیتیں چھوٹی سطح سے اس کام کا آغاز کرسکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا محمد حنیف ندوی کی فکر سے بڑی علمی رہنمائی مل سکتی ہے۔

ضرورت ہے کہ آپ مذکورہ فاضلوں کی کتابیں دوچار بار مطالعہ کریں، اس سے اس فکر کی نوعیت اور اس کے استدلال کے توڑ کا ادراک حاصل ہوگا۔ اس کے بعد (جیسا کہ آپ علماء کرام کے مختلف پروگرام رکھتے ہیں) ان کی جدیدیت کے حوالے سے ذہنی تربیت کا پروگرام رکھیں، جس میں ان کی ذہنی استعداد کے مطابق الحاد ودہریت کے اس ہمہ گیر چیلنج سے انہیں آشنا کریں۔ اگر یہ کام باقائدگی اور مستقل مزاجی کے ساتھ ہوتا رہے تو اس کے بہت سارے فوائد حاصل ہوں گے، ایک یہ کہ علماء کرام

کے سامنے مسلکی اختلافات اور فروعی مسائل کی اہمیت کم ہوجائے گی، جس سے امت میں تفریق اور ایک دوسرے سے دوری کی روش میں کمی واقع ہوگی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقات خدا، اسلام، اسلامی احکامات اور مذہب کے بارے میں جن سوالات، اشکالات والجھنوں کا شکار ہیں، علماء کرام ان کی اس ذہنی نوعیت کو سمجھکر ان کی ذہنی سطح سے بات کرکے، ان کے شکوک کی دوری کا باعث ہوں گے۔

تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ علماء کرام اور جدید طبقات کے درمیاں پیدا شدہ ذہنی خلیج جو تیزی سے بڑھتی جارہی ہے، اس میں کمی واقع ہوگی۔

ظاہر ہے شروع میں یہ کام مشکل نظر آئے گا اور اس میں بہت ساری مشکلات بھی درپیش ہوں گی، لیکن ہمت اور حوصلہ سے اگر کام شروع کیا جائے تو انشاء اللہ، اللہ کی طرف سے راستے کھلتے جائیں گے۔

آپ نے اگرچہ دور جدید کے بیشتر اسلامی مفکروں وفاضلوں کا مطالعہ کیا ہے، جو بڑی خوشی کی بات ہے، لیکن ضرورت ہے کہ ان مفکروں کی مختلف کتابوں کا کئی کئی بار مطالعہ کیا جائے، اس سے ان کی فکر کو ہضم کرنے اور ان کی زندگی بھر کے مطالعہ ومشاہدہ اورغور وفکر کے حاصل سے اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ اس کے بعد آپ خود اس کام کے لئے اصل داعی کی حیثیت سے مؤثر کردار ادا کرسکیں گے۔

اس موضوع پر اس عاجز نے اپنی کتاب ''صدائے محبت'' میں کافی تفصیل سے بحث کی ہے، وقت ملے تو اس کتاب پر دوبارہ نظر ڈالیئے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام
احقر
محمد موسیٰ بھٹو

محمد عمار خان ناصر صاحب

محمد عمار خان ناصر صاحب، مولانا زاہد الراشدی صاحب کے فرزند ارجمند ہیں۔ غیرمعمولی علمی وذہنی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ لکھنے کا اچھا ملکہ حاصل ہے۔ مزاج میں صبر وتحمل کے اجزاء غالب ہیں۔ انہوں نے علامہ جاوید احمد غامدی صاحب کی شاگردی اختیار کرکے، ان کے فکر کو اخذ کرکے، اپنی شخصیت کے ساتھ ساتھ مولانا زاہد الراشدی صاحب کی شخصیت کو بھی مجروح کیا ہے۔

جاوید غامدی صاحب،جدیدیت سے بری طرح متاثر ہیں، ان کی فکر میں اسلامیت کو جدیدیت کا رنگ دینے کا پہلو غالب ہے اور سلف کی تحقیق سے نہ صرف بے نیازی کا غلبہ ہے، بلکہ خود کو مجتہد مطلق اور سلف صالحین کے مقام پر سمجھنے کی نفسیات مستحکم ہے۔ محمد عمار خان صاحب،جدیدیت سے مرعوب، اس شخصیت کی صحبت سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ عرصہ سے ''الشریعت'' کے مضامین میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ زیر نظر خط میں موصوف کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

برادرم محمد عمار خان ناصر صاحب، مدیر الشریعت

السلام علیکم : مزاج شریف

ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب مرحوم کے بارے میں ''الشریعت'' کی طرف سے خصوصی نمبر نکلنے کی خبر سن کر خوشی ہوئی۔ موصوف سے اس عاجز کا خاص تعلق تھا، ''بیداری'' کے لئے ان کی شخصیت پر تفصیلی مضمون لکھا ہے، ان کے دس بارہ خطوط بھی مضمون میں شامل ہیں۔ کوشش کروں گا کہ اس مضمون کی نقل ارسال کروں، ورنہ آپ ''بیداری'' کے شمارے سے لے سکیں تو ممنوں ہوں گا۔

آپ کی ذہانت اور راشدی صاحب کے فرزند ہونے کے ناطے سے محبت کا تعلق رہا ہے، لیکن ساتھ ساتھ سخت افسوس بھی ہے کہ آپ نے سلف اور خلف سب

سے جداگانہ راہ اختیار کرنے والے محترم جاوید احمد غامدی صاحب کی شاگردی اختیار کی، اس طرح آپ امت سے کٹ کر، ایک شخص کے دائراتی فکر کے خول میں بند ہوگئے۔ راقم کی نظر میں یہ بہت بڑا نقصان ہے، جو ہوا ہے۔

حضرت مولانا سرفراز احمد سرفراز صاحب اور مولانا زاہد الراشدی صاحب کے ہاں آخر کس چیز کی کمی تھی کہ جس کی تکمیل آپ نے جاوید صاحب سے کرنی چاہی۔ سلف صالحین کی دینی فکر ایسی ہے، جس پر فساد زدہ دور میں آنکھیں بند کرکے، اعتماد کرنا ضروری ہے، ورنہ اجتہاد کے نام پر فرد وافراد اپنے بنیادی سرمایہ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس سلسلہ میں آپ سے بحث مقصود ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اپنے اس دلی صدمہ کا اظہار ہے، جو جاوید صاحب کی فکر سے مرعوب ہونے اور ان کے ادارہ میں کام کرنے کی خبریں سن کر ہوا ہے۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب جیسی جہاندیدہ ''شخصیت نے آپ کو جاوید صاحب سے علمی استفادہ کی اجازت دی، معلوم نہیں، مولانا نے یہ اجازت کیوں دی؟ اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا، وہ ظاہر ہے کہ ہم لوگ آپ جیسے ذہین فرد کی علمی صلاحیتوں سے محروم ہوگئے۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب کی زیر نگرانی نکلنے والے رسالہ اور اب آپ کی نگرانی میں نکلنے والے ''الشریعت'' میں بنیادی فرق واقع ہوگیا ہے۔ اب رسالہ پر جاوید صاحب کی فکر کی چھاپ واضح طور پر محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس صورتحال پر سوائے دکھ، افسوس اور دعا کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس دکھ کا اظہار اس عاجز نے ''بیداری'' اکتوبر کے شمارہ میں دینی مدارس کے ذمہ داروں کے نام مضمون میں بھی کیا ہے۔

والسلام
احقر
محمد موسیٰ بھٹو

ڈاکٹر اقبال علی صاحب

ڈاکٹر اقبال علی صاحب این ای ڈی، یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ موصوف حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ کے قریبی افراد میں شامل رہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کے ہاں ہونے والی اصلاحی نوعیت کی ساری تقریبات میں وہ مستقل مقرروں میں شامل تھے۔ اب موصوف سال کا زیادہ تر وقت امریکہ میں اپنے بیٹے کے ہاں گذارتے ہیں۔

۸ستمبر ۲۰۰۹ء
محترم جناب گرامی قدر ڈاکٹر اقبال علی صاحب
السلام علیکم : مزاج شریف
کتابیں آج کی ڈاک سے خدمت میں ارسال ہیں۔

علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ اسلامی دنیا میں آئندہ جب بھی کوئی معاشرتی انقلاب برپا ہوا (اسلامی نقطہ نگاہ سے) تو وہ صوفیہ کے نفوس قدسیہ کی وجہ سے ہوگا۔

اس عاجز نے جدید طبقات میں ''تصوف کے پھیلاؤ کے سلسلہ میں بہت غور وفکر کیا ہے، ایک بڑی رکاوٹ اس عاجز کو یہ نظر آئی کہ اہل تصوف کی طرف سے جدید اسلامی طبقات کے سامنے جب تصوف کو اس کے اصل مقصود یعنی اللہ کی محبت بذریعہ ذکر وفکر وصحبت صالحہ کی بجائے کشف، کرامات، تصرفات اور القا وغیرہ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تو یہ بات جدید اسلامی طبقات اور اسلامی حضرات کے لئے ناقابل قبول ہوجاتی ہے۔ کشف وکرامات یقیناً اہل اللہ سے صادر ہوتی ہیں اور انہیں دوسری دنیا کے مشاہدات بھی ہوتے ہیں، لیکن سارے بڑے بڑے بزرگوں کی تصریحات کے مطابق کشف وغیرہ کو نہ تو مقصود کے درجہ کی حیثیت حاصل ہے، نہ تصوف کے اصولوں کی، بلکہ یہ تو محبوب کے رازوں میں سے ایک راز ہے، جس کا اخفا ہونا ضروری ہے۔

بعض بزرگانِ دین حالت سکر کے غلبہ میں اس کا اظہار کردیتے ہیں، جو معذور ہیں۔

ضرورت ہے کہ دور جدید میں تصوف کی ان چیزوں کو جو دوسری دنیا کے مشاہدات سے تعلق رکھتی ہیں، انہیں اہمیت نہ دی جائے۔ اصل اہمیت اللہ کی محبت اور ذکر وفکر اور صحبت شیخ کو دی جائے، جس کی وجہ سے نفس امارہ سے نفس مطمئنہ کے مراحل طے ہوتے ہیں اور اخلاص اور اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں اور اللہ کے استحضار کا غلبہ ہوتا ہے۔

کشف وکرامات کو فیصلہ کن اہمیت دینے اور اجتماعات وکتابوں میں اسے بنیاد بنانے سے ایک تو جدید طبقات، تصوف واہل تصوف سے بدک جاتے ہیں اور وہ شدید غلط فہمی کا شکار ہونے لگتے ہیں، دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ عام مریدوں کا یہ ذہن بننے لگتا ہے کہ تصوف کا اصل مقصود اور اس کی اصل منزل ذکر میں مداومت اور اصلاح نفس نہیں، بلکہ دوسری دنیا کے مشاہدات ہیں، اس عاجز کو یہ خطرہ نظر آرہا ہے کہ ہمارے مرشدی حضرت صاحب کے حلقہ کا رخ تیزی سے کشف وکرامات کی باتوں کی طرف جارہا ہے، جس کی وجہ سے خطرہ ہے کہ ہمارا سلسلہ سجن سائیں کی طرح بریلوے مکتبہ فکر کا رخ اختیار نہ کر جائے۔ سجن سائیں والوں کے ہاں تصوف کی بنیاد علم کی بجائے کشف وکرامات ہیں، جس کی وجہ سے ایک تو مریدوں کی ذہنی وعلمی سطح بہت کمزور ہے۔ دوم یہ کہ وہ معاشرہ کے سارے طبقات سے کٹ کر کلی خیر کو سجن سائیں کے ہاں موجود ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔

اس مرتبہ حضرت حافظ منیر احمد خان صاحب کی اس عاجز نے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کے عرس کی تقریب میں تقریر سنی، آدھے پون گھنٹے کی ساری تقریر حضرت صاحب کے کشف وکرامات پر مشتمل تھی۔ مجھے دو نئے حضرات نے کہا کہ جس تصوف کے حق میں تم نے اتنی ساری کتابیں لکھی ہیں، حافظ صاحب کی تقریر سے تو معلوم ہوا کہ تصوف نام ہی کشف وکرامات اور دوسری دنیا کے مشاہدات کا ہے، تقریر میں ذکر، اخلاق حسنہ اور اصلاح نفس کو تو موضوع ہی نہیں بنایا گیا، جس کے لئے حضرت صاحب نے ساری زندگی صرف کر ڈالی۔

آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس عاجز کے اس نکتہ پر غور فرمائیں۔ اور حضرت ڈاکٹر صاحب کے حلقہ کو جو دیوبندی اور بریلوی مکتبہ فکر کے درمیاں توازن کا بہترین حلقہ تھا، اسے بریلویت کی راہ پر جانے سے بچائیں۔

یہ عاجز حضرت قبلہ مرشدی کے کشف کرامات اور دوسری دنیا کے مشاہدات پر یقین رکھتا ہے، لیکن یہ واقعات تصوف کی بنیاد ہرگز نہیں اور نہ ہی اکابر بزرگوں کی نظر میں ان کی تشہیر کی اجازت ہے، بالخصوص جدید دور میں تو عقلیت کے غلبہ کی وجہ سے اس پر زور دینے سے اہل علم اور اہل دانش کو تصوف واہل تصوف سے دور کرنا ہے۔

اگر اس عاجز کی یہ درخواست آپ کی طبیعت کے لئے ناراضگی کا موجب ہو تو یہ عاجز دل کی گہرائیوں سے معافی کا خواہاں ہے۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

ڈاکٹر امیر بخش چنہ صاحب

ڈاکٹر امیر بخش چنہ صاحب، پچھلے ۳۲ سال سے ریاض سعودی عرب میں ریاض کی سرکاری کنگ خالد یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑی صاحب علم شخصیت ہیں۔ عربی اور اردو میں قرآن مجید کی بیسیوں تفسیروں کا انہوں نے مطالعہ کیا ہے۔ موصوف اسریٰ یونیورسٹی حیدرآباد کے بانیوں میں شامل ہیں۔ اسریٰ یونیورسٹی کو کاروباری ادارہ کی بجائے علمی دعوتی اور سماجی خدمت کے ادارہ کی حیثیت دینے کا ان کا بڑا منصوبہ تھا، اس مقصد کے لئے وہ بڑے ذوق وشوق سے سعودی عرب سے یہاں واپس آ گئے تھے، لیکن نامساعد حالات دیکھکر موصوف ریاض واپس ہونے پر مجبور ہوئے، ڈاکٹر صاحب نے سندھی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے، کہیں کہیں تشریح بھی کی ہے، یہ ترجمہ انہوں نے کافی بڑے پیمانہ پر شائع کرکے اعزازی طور پر پھیلایا ہے۔ یہ خط، کمپوزنگ کے خط کے سلسلہ میں انہیں ارسال کیا گیا تھا۔

۲۳ستمبر ۲۰۰۷ء

محترم جناب گرامی قدر ڈاکٹر امیر بخش چنہ صاحب

السلام علیکم: مزاج شریف

قرآن شریف کے نقل کے سلسلہ میں سعید صاحب سے گفتگو ہوئی ہے، لیکن ان کے بچوں کی حماقت کی وجہ سے اور کچھ قانونی حقوق کے عدم شعور کی وجہ سے اس قرآنی خط کے سلسلہ میں ان سے بے احتیاطی ہوئی ہے، اس سلسلہ میں یہ عاجز معذرت اور معافی کا درخواست گزار ہے۔

چونکہ یہ عاجز درمیاں میں آیا تھا، اس لئے یہ قصور وار اور ذمہ دار ہے۔ اپنی غلطی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے یہ عاجز ہر مناسب سزا برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔

یہ عاجز اس معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی گوش گذار کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن کی بہتر خط اور خوبصورت خط کے ساتھ اشاعت ایک داعی اور دردمند مسلمان کی حیثیت سے آپ کی اور ہماری آرزو ہے۔ اگر بہتر خط والا قرآنی نسخہ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں شائع ہو اور وہ ہر فرد تک پہنچ جائے تو ایک داعی کی اس سے بڑھ کر آرزو اور خوش بختی اور کیا ہوسکتی ہے۔ قرآنی اشاعت کے ذریعہ کاروبار ایک ضمنی مسئلہ ہے۔ دردمند مسلمان کے سامنے اصل مقصود اشاعت قرآن ہی ہونا چاہئے۔ آج کل ایک سے بڑھ کر بہتر سے بہتر قرآنی خطوط سامنے آئے ہیں اور فی سبیل اللہ تقسیم ہورہے ہیں، ان قرآنی خطوط کی اسکریں کے ذریعہ کمپیوٹر میں ازسر نوسیٹنگ اور مختلف اداروں کی طرف سے ان کی اشاعت کا کام ہورہا ہے۔ لاہور اور کراچی سے اس طرح کے کئی قرآن شریف شائع ہوئے ہیں۔

اس عاجز کے خیال میں قرآن کی اشاعت کے کام کو قانونی اور معاشی ترقی وحقوق سے بلند ہوکر دیکھا جائے تو بندہ کی یہ ادا ایسی ہے، جو اللہ کو بہت زیادہ پسند ہے اور اخلاص کا بھی یہی پیمانہ ہے، ایک داعی کی آرزو تو یہ ہونی چاہئے کہ قرآن کے سلسلہ میں کی گئی میری محنت کو دوسرے لوگ اور دوسرے ادارے اپنے اپنے انداز سے میرے نام کے بغیر پیش کریں، تاکہ میرے نام کے بغیر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچ سکے اور میرے لئے ذخیرہ آخرت کا سامان ہوتا رہے۔

خالص توحید کے بہت سارے تقاضے ہیں۔ ان میں ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ بندہ، دعوت توحید یعنی، اشاعت قرآن کے کام کو اپنا کام سمجھے اور یہ کام جس شخص اور ادارہ کی طرف سے بھی ہو، اسے اپنا سمجھا جائے، اور اس سلسلہ میں ہر شخص وہر ادارہ سے اپنی طرف سے دامے درمے سخنے تعاون کے لئے تیار ہو۔ ممکن ہے میرے اخلاص اور توحید کا پیمانہ مبالغہ آمیز ہو، لیکن یہ بھی ایک نقطہ نگاہ ہے۔ امید ہے کہ اس پر غور وفکر فرمائیں گے۔

اس عاجز کی نظر میں تو آپ کے خط والا قرآن جہاں جہاں پہنچے گا، وہ آپ کے لئے آخرت میں تحفۂ ثابت ہوگا۔ اس عاجز نے قرآن کے حوالے سے جو بھی

چیزیں چھاپی ہیں یا بخاری شریف وغیرہ، ان سب کے بارے میں یہی آرزو ہے کہ لوگ انہیں زیادہ سے زیادہ چھاپیں اور پھیلائیں، اجازت کی ہرگز ضرورت نہیں۔

ایک اور اہم گذارش یہ بھی ہے کہ سندھی زبان میں قرآن مجید کی اشاعت کا کام وہ چاہے متن سے ہو یا ترجمہ سمیت، وہ مالی اعتبار سے سراسر خسارہ کا سودہ ہے، اس لئے کہ سندھی افراد میں عام طور پر مارکیٹ سے پیسوں سے قرآن لینے کا رواج نہیں، اس لئے وہ افراد اور سندھ کے وہ ادارے آپ اور ہم جیسے دردمند دینی داعیوں کے اخلاقی تعاون اور ہمدردی کے مستحق ہیں، جو اشاعت قرآن کا کام کرتے ہیں۔ ہم اگر انہیں اچھے وخوبصورت متن قرآن کی سہولت فراہم کریں تو یہ ہمارے لئے بجائے خود اعزاز اور خوش بختی کی بات ہے، اگر ادارہ دارالاسلام نے اس سلسلہ میں وسعت ظرفی کا مظاہرہ کیا تو آخرت میں تو انہیں اجر حاصل ہوگا ہی، اس اخلاص کی بدولت دنیا میں بھی خیروبرکت حاصل ہوگی۔

اس عاجز کا ایک نقطہ نگاہ یہ بھی ہے اور اس پر عمل بھی ہے کہ دین کے کام کرنے والے سارے ادارے اور ساری شخصیتیں اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کے باوجود وہ ہمارا اپنا سرمایہ ہیں۔ ان کی غلطیوں کی حکمت سے نشاندہی تو ضرور ہو، لیکن انہیں اپنے سے جدا سمجھنا، انہیں تردید وتنقیص کا نشانہ بنانا، یہ دین کی حکمت وآداب کے منافی ہے۔

اس پورے خط کو اس پس منظر میں شمار فرمالیں تو انشاء اللہ کبیدگی خاطر نہ ہوگی۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

مولانا ساجد مقصود فاروقی صاحب

مولانا ساجد مقصود فاروقی صاحب، مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ موصوف نے اپنے ایک خط میں مولانا حقانی صاحب کی کتاب پر کئے گئے ہمارے تبصرے (جو ''بیداری'' اور ''القاسم'' دونوں میں شایع ہوا) کے ایک تنقیدی نکتہ پر توجہ دلائی تھی اور لکھا تھا کہ '' القاسم'' میں اگر حضرت مولانا حقانی صاحب کے کاموں کی تعریف ہوتی ہے تو وہ اس کے حقیقی ممنوں میں مستحق ہے، اس پر اعتراض کیوں؟ موصوف کے اس خط کے جواب میں یہ عریضہ ارسال کیا گیا ہے۔

۲۹ دسمبر ۲۰۱۲ء

عزیزم مولانا ساجد مقصود فاروقی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کی شخصیت پر آپ کا تفصیلی مضمون نما خط ملا، مشکور ہوں کہ آپ نے اپنی یادوں کے حوالے سے مولانا کی شخصیت کے اہم، نمایاں اور قابل رشک پہلوؤں سے آشنا فرمایا، یہ عاجز مولانا کے علم وفضل اور دینی خدمات کا شروع سے مداح ہے۔ آپ کے خط سے اس میں اضافہ ہی ہوا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھ جیسا سیاہ کار فرد حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب جیسی صاحب علم وفضل اور بزرگان شان کی حامل شخصیتوں کی غلامی بجالانے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے اور ان کی خدمت کو اپنی اصلاح کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

اس عاجز نے مولانا کی کتاب پر جو تبصرہ لکھا ہے، وہ حضرت مولانا کے اصرار پر لکھا تھا، حالانکہ اس عاجز کی اعصابی اور ذہنی حالت اس قابل نہیں ہے کہ کتابوں کا مطالعہ کرکے ان پر سیر حاصل تبصرہ کرسکے۔ حضرت مولانا کے بہت اصرار کے بعد کتاب کا مطالعہ کرکے تبصرہ کیا تھا۔

حضرت مولانا کی شخصیت پر دوچار جملے جو تنقیدی آگئے ہیں، حیران ہوں کہ وہ

کیسے اور کیونکر آ گئے۔ ہاں، یاد آیا کہ اس عاجز سے محبت کرنے والے تین چار بزرگوں نے جنہیں مولانا سے میرے خصوصی تعلق کا علم ہے، اس طرف توجہ دلائی تھی کہ حضرت مولانا کے رسالہ میں ان کی شخصیت کے بارے میں مسلسل اس طرح کا مواد شایع ہوتا ہے، معافی کا خواہاں ہوں اور حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب سے ہاتھ باندھکر معافی کا طلبگار ہوں کہ ان بزرگوں کی گفتگو کو قلم نے اچک لیا۔

امید ہے کہ حضرت مولانا صاحب معاف فرمائیں گے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

خلیل الرحمٰن چشتی صاحب

خلیل الرحمٰن چشتی صاحب راولپنڈی میں جدید افراد کو قرآنی تعلیم سکھانے کا ایک ادارہ چلارہے ہیں۔ اس سلسلہ میں موصوف نے کچھ کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔ ان کا خاندان، تصوف واہل تصوف سے وابستہ رہا ہے، لیکن موصوف خود کافی عرصہ تک وسیع مطالعہ کے بعد مولانا مودودی کی فکر اور جماعت سے وابستہ ہوگئے ہیں اور جماعت میں بڑی دعوتی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ موصوف نے اپنے ذہنی وعلمی سفر اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے تعلقات کے سلسلہ میں دس بارہ صفحات پر مشتمل خط لکھا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کی تصوف کی لائین کو صحیح نہیں سمجھتے۔

۴ستمبر ۲۰۰۹ء

محترم جناب گرامی قدر خلیل الرحمٰن چشتی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

آپ کی ارسال کردہ کتابیں اور تفصیلی عنایت نامہ ملا، ممنوں ہوں کہ آپ نے یاد فرمایا۔

آپ نے مجھ جیسے علمی اعتبار سے تہی دست فرد کو خط میں جس معلومات سے فیضیاب فرمایا ہے، اس کے لئے دل کی گہرائیوں سے ممنوں ہوں۔

اصل میں یہ عاجز علمی اعتبار سے بے مایہ ہے، اہل اللہ کی صحبت کے نتیجہ میں اللہ کی محبت کا معمولی جزو حاصل ہے۔ ہماری ساری تحریریں اس محبت ہی کا نتیجہ ہیں۔ قرآن وسنت کی تعلیمات کو پھیلانا آپ جیسے اہل علم کا کام ہے، ہم جیسے محبت کے راہوں کا کام محبت کی شمع جلانا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ علمی طور پر آپ نے جو باتیں تحریر فرمائی ہیں، تقریبا یہی چیزیں اہل تصوف سے وابستگی سے پہلے شدت کے ساتھ اس عاجز کے ذہن میں بھی

برسوں تک خاص ماحول میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی، ذہن یہ ہوگیا تھا کہ قرآن وسنت اور دین کے نصب العین کو ۱۳ سو سال میں امت نے نہیں سمجھا، سوائے امام ابن تیمیہ اور اوار امام ابن قیم جیسی چند شخصیتوں کے اور اب پہلی بار دین کے صحیح مفہوم اور اللہ کے رسول کے مقصد کو ہم نے سمجھا ہے۔

۱۳ سال تک ذہن انہی اشکالات کے گرد گھومتا رہا اور سلف صالحین کے فہم دین پر اعتماد ختم ہوگیا تھا، اہل تصوف سے وابستگی، اور صحبت کے بعد اب ذہن یہ ہے کہ ہمارا علم، ہماری عقل اور ہمارا فہم دین، ہمارا تقویٰ، ہماری بصیرت، ہماری حکمت ومعرفت وغیرہ سلف صالحین کے علم، عقل اور فہم دین کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ قطرہ کو سمندر سے کیا نسبت ہوسکتی ہے۔

امید ہے کہ معاف فرمائیں گے، اس خط کو نہ آپ اپنے نکات کو ٹالنے پر معمول فرمائیں گے اور نہ بات کو طول دینا اور جواب درجواب کا سلسلہ شروع ہونے پر محمول سمجھیں گے۔

اللہ کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام
احقر
محمد موسیٰ بھٹو

صدر وسیکریٹری تنظیم فکر ونظر سکھر

تنظیم فکر ونظر سندھ کا اہم علمی وادبی ادارہ ہے، پروفیسر اسد اللہ بھٹو صاحب اس کے بانی تھے۔ سابق صدر ضیاء الحق کی طرف سے اس ادارہ کو سکھر شہر کے درمیاں میں کئی ایکڑ زمین الاٹ کی گئی، جس کی اس وقت تین ارب روپے سے زیادہ قیمت ہے۔ تنظیم سے ضیاء الحق کی حکومت نے کافی مالی معاونت بھی کی تھی، تاکہ وہ سندھ میں لادین قوتوں کے مقابلہ اور علمی میدان میں فروغ اسلام کے لئے بھرپور کام کرسکے، لیکن سہولتیں اور مراعات ملنے کے بعد تنظیم کے ذمہ دار حضرات ایک نئی آزمائش میں مبتلا ہوگئے اور ایک دوسرے سے رسہ کشی کا شکار ہوگئے۔ برسوں تک کورٹ میں مقدمات چلتے رہے۔ بمشکل ان مقدمات سے نجات ملی تو پھر دوبارہ باہمی رقابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک سال پہلے تنظیم کے ذمہ دار صاحبان دوبار حیدرآباد میں میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے مجھے اس بات کے لئے قائل کرنے کی کوشش کی کہ تنظیم میں جدیدیت کے سیلاب کا علمی طور پر مقابلہ کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی علمی شخصیت موجود نہیں ہے۔ آپ حیدرآباد میں بیٹھکر ہماری تنظیم کی طرف سے سندھی زبان میں ماہانہ بنیادوں پر ایک سے دو کتابیں شائع کرکے، سندھ بھر میں پھیلانے کا پروگرام مرتب کریں، اس کے لئے وسائل ہم فراہم کریں گے۔ راقم الحروف نے ان سے عرض کیا کہ میرا تیس چالیس سالہ تجربہ ومشاہدہ ہے کہ دوست وعدے اور باتیں تو بہت کرتے ہیں، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو وہ ایک قدم بھی اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم نے حالات وتجربات اور باہمی رسہ کشی سے بہت کچھ سیکھا ہے، اب ہم دونوں گروپ عملی طور پر کام کرنے کے سلسلہ میں سنجیدہ ہیں، چنانچہ انہوں نے مجھے اپنی مرکزی باڈی کی منظور

شدہ قرارداد بھی دکھائی، جس میں کہا گیا تھا کہ تنظیم کے علمی کام کے لئے محمد موسیٰ بھٹو صاحب سے درخواست کی گئی تھی، جو انہوں نے منظور کر لی ہے اور اب تنظیم کا سارا علمی ادبی، فکری اور نظریاتی کام ان کی سرپرستی میں حیدرآباد سے ہوگا۔

ان کی اس یقین دیانی کے بعد میں یکسو ہوگیا اور پانچ چھ ماہ لگ کر تنظیم کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کے لئے چھ سات کتابیں پریس میں جانے کے لئے تیار کرلی۔ اس عرصہ میں متعدد بار ان کو یاد دہانی کرائی گئی کہ کتابیں پریس میں جانے کے لئے تیار ہیں۔ رقم ارسال کی جائے۔ لیکن معلوم ہوا کہ پرانا خلفشار پھر عود کر آیا ہے اور تنظیم، علمی ونظریاتی کام سے دستبردار ہوگئی ہے۔ اور ان کی پھر بیشتر توانائیاں باہمی تنازعات میں صرف ہونے لگی ہیں۔

یہ دوخطوط اسی پس منظر میں تنظیم کے صدر اور سیکریٹری صاحبان کو لکھے گئے ہیں۔

محترم جناب گرامی قدر صدر وسیکریٹری تنظیم فکر ونظر سکھر

السلام علیکم : مزاج شریف

تنظیم فکر ونظر کے نئے انتخاب اور اس میں محترم محمد علی راجپر صاحب اور آپ کے عہدداروں کی حیثیت سے سامنے آنے سے از حد خوشی ہوئی۔ خوشی اس لئے ہوئی کہ تنظیم پچھلے پچیس تیس سال سے جس خلفشار کا شکار تھی، اس سے سندھ کے دوسرے درد مند اور حساس اہل علم کی طرح یہ عاجز بھی تنظیم پر بسم اللہ پڑھ چکا تھا کہ اب اس خلفشار سے نکلنا دشوار ہے اور نئے سرے سے تنظیم کی طرف سے سندھ میں بڑے پیانے پر نظریاتی اور علمی کام کی توقع رکھنا اور قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کے مقابلہ کا انتظام ہونا مشکل ہے، لیکن جب محترم لیاقت علی صاحب، اصغر مجاہد مہر صاحب اور فضل اللہ مھیسر صاحب نے بتایا کہ تنظیم کی نئی باڈی سامنے آئی ہے اور وہ نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ سندھ کے نظریاتی محاذ پر کام کرنا چاہتی ہے تو سچی بات یہ ہے کہ خوشی ہوئی، لیکن چونکہ پچھلے تجربات بہت تلخ تھے کہ ساری کوششوں کے باوجود دوستوں کے درمیاں مصالحت نہیں ہو پارہی تھی، اس لئے خوشی کے احساسات کے ساتھ ساتھ دل میں مدھم یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ شاید شیطان اتنے بڑے ادارہ کو کام کرنے نہ دے اور پھر نئی مشکلات نہ کھڑی ہوجائیں۔

پچھلے دیڑھ ماہ سے محترم لیاقت علی صاحب، اصغر مجاہد مہر صاحب اور فضل اللہ مہیسر صاحب اس عاجز کے ساتھ رابطے میں تھے اور ان تینوں کا اصرار تھا کہ آپ کو سندھی زبان میں علمی محاذ پر نظریاتی کام کرنے کا کافی تجربہ ہے اور لٹریچر پر وسیع نگاہ ہے اور قوم پرستوں اور ترقی پسندوں کے فکر کے جواب میں مؤثر لٹریچر تیار اور شایع کرنے کا اللہ نے آپ کو ملکہ دیا ہے، آپ اس کام میں ہماری مدد کریں، بلکہ سرپرستی کریں، تاکہ جدید سندھی نوجوانوں کو لادینیت کے سیلاب میں بہنے سے بچایا جائے۔

اس عاجز کے سامنے چونکہ پچھلے تیس چالیس سال کے تلخ ترین تجربات تھے کہ زوال پذیر معاشرہ کے اکثر اہل علم اور اہل دانش کی حالت یہ ہے کہ وہ نہ تو خود کام کرتے ہیں اور نہ ہی کام کرنے والوں کو کام کرنے دیتے ہیں۔ بلکہ ان کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہتے ہیں، ان تلخ تجربات ومشاہدات کی وجہ سے یہ عاجز تقریبا پچھلے ۳۲ سال سے اکیلا کام کر رہا ہے، البتہ بعض دوستوں وساتھیوں سے اچھے مشورے اور تعاون مل جاتا ہے، اس تنہا پرواز کی وجہ سے الحمدللہ ہم نے پچھلے ۳۲ سال کے دوران دیڑھ سو سے زائد کتابیں شائع کی ہیں اور بیشتر کتابیں نظریاتی، علمی اور فکری نوعیت کی ہیں۔ اور قوم پرستی، کمیونزم، ترقی پسندی، جدیدیت، سیکولرزم اور محمد بن قاسم اور راجا ڈاہر ایک مطالعہ وجائزہ اور اسلام کی سائنٹفک صداقت کے موضوعات پر ہیں۔ البتہ وسائل کی کمی کی وجہ سے کتابیں جس بڑے پیانہ پر شائع ہوکر، سندھ بھر کے علمی حلقوں میں پھیلنی چاہئے، وہ پھیل نہ سکیں اور ایک ایک ہزار کی ایڈیشن کے بعد اکثر کتابیں دوبارہ شائع نہ ہوسکیں، پھر پچھلے بائیس سال سے سندھی زبان میں ماہنامہ ''بیداری'' رسالہ شائع کرنے کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت کے لئے ہمارے پاس وسائل نہ ہونے کے برابر رہے ہیں۔

سندھ میں پچھلے پچاس ساٹھ سال سے اسلام کو جو چیلنج درپیش ہے، وہ بہت بڑا

چیلنج ہے، وہ چیلنج یہ ہے کہ جی ایم سید، ابراہیم جویو، رسول بخش پلیجو، سو بھوگیان چندانی وغیرہ کی کوششوں سے ہمارے ہزاروں ذہین افراد ملحد، دہرے، کمیونسٹ اور سیکولرسٹ بن چکے ہیں۔ وہ مسلم ملت کے تصور کو سندھی قوم کی تباہی کا باعث سمجھتے ہیں۔ اور دنیا میں فساد کا ذریعہ اسلام کے جہاد کے تصور کو قرار دیتے ہیں۔ یہ دانشور پوری سندھی میڈیا پر قابض ہیں اور میڈیا کے ذریعہ مسلسل یہ زہر پھیلاتے رہتے ہیں۔ ان کا جواب دینے اور نئی نسل کو ان کے پروپیگنڈہ سے بچانے کے لئے ہمارے پاس نہ تو کوئی اخبار ہے اور نہ ہی طاقتور اشاعتی ادارہ ، ہمارے اپنے ادارہ سندھ نیشنل اکیڈمی کی حالت یہ ہے کہ اس میں پچھلے ۳۲ سال سے سارا کام ایک فرد واحد خود ہی کررہا ہے، اس کے پاس عملہ تو کیا، معاون دفتر بھی نہیں ہے۔

اب ہماری نسلیں ہمارے ہاتھ سے نکل چکی ہیں۔ سندھ کے سارے مذہبی طبقات قوم پرستوں سے یا تو مرعوب ہیں یا ان سے متاثر ہیں۔

اس سیلاب کی روک تھام کا کام چند افراد بے بسی کی حالت میں انفرادی سطح پر کررہے ہیں، شکارپور سے پروفیسر عبدالرحمٰن جتوئی صاحب اور خیرپور میں حزب اللہ سومرو صاحب اس محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ لیکن اس سیلاب کے مقابلہ میں قوم کے اجتماعی وسائل اور اجتماعی صلاحیتیں صرف ہونی چاہئے۔ تب کہیں جاکر اس سے بہتر مقابلہ کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ سندھ میں قوم پرستی اور ترقی پسندی کی تحریک، جو طاقتور ہوئی ہے، وہ لٹریچر اور فکر سے ہی پیدا ہوئی ہے، لٹریچر کا مقابلہ لٹریچر سے اور فکر کا مقابلہ فکر سے ہی ہوسکتا ہے۔ اگرچہ سیلاب کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ تاہم اب بھی وقت گیا نہیں ہے۔ کام کی ضرورت ہے، سخت کام کی۔ ایسے لٹریچر کی ضرورت ہے، جو خالص علمی، فکری اور نظریاتی واستدلالی نوعیت کا ہو اور سائنٹفک انداز کا ہو، پھر یہ لٹریچر سندھ کی علمی وادبی اور تحریکی شخصیتوں اور سندھی اداروں تک ہر ماہ ڈاک کے ذریعہ پہنچنا چاہئے۔ ہم نے جب یہ کام شروع کیا تھا تو کافی ذہین افراد ہم سے رابطہ میں آئے اور الحمدللہ ہم نے اپنی بساط کے مطابق ان کی تربیت کی کوشش کی۔

اس ساری تفصیل سے مقصود یہ گزارش کرنی ہے (درد دل کے ساتھ کہ) تنظیم فکر ونظر کی نئی قیادت کو ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سندھ میں اسلام اور ملت کو درپیش چیلنج کے مقابلہ کے لئے صحیح اور بہتر پلاننگ کے ساتھ کام کا آغاز کرنا چاہئے۔ اور اس مستعدی کے ساتھ کام کرنا چاہئے کہ خلا بھی کسی حد تک پُر ہوجائے اور اسلام دوست حلقوں میں تنظیم کے طویل تعطل کی وجہ سے جو تاثر پیدا ہوا ہے، اس کی دوری کی صورت بھی پیدا ہوجائے۔

اس عاجز نے محترم لیاقت علی صاحب اور اصغر مجاہد صاحب سے شروع میں ہی عرض کیا تھا کہ میرے تجربات بڑے تلخ ہیں۔ دوست تعاون کے لئے کہتے ہیں، لیکن بات قیل قال سے آگے نہیں بڑھتی۔

اس طرح میرا وقت بھی ضایع ہوتا ہے۔ پھر ایسے دوستوں کے ساتھ کام کرنے کے لئے طبیعت بھی نہیں چاہتی، جو کافی عرصہ تک عدم مفاہمت کی حالت میں رہے ہوں۔ اب بھی اس عاجز کا نقطہ نگاہ یہی ہے کہ میں جو ٹوٹا پھوٹا کام اپنے طور پر کررہا ہوں، وہ ہوتا رہے۔

اس خط کا مقصود یہ ہے کہ آپ کو درد دل کے ساتھ عرض کی جائے کہ تنظیم کے نئے قائد (سیکریٹری) کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داریاں بہت اہم ہیں۔ دوستوں سے آپ کے جذبۂ اخلاص کی بہت تعریف سنی ہے، آپ کی معمولی توجہ سے انشاء اللہ بہت کام ہوگا۔ آپ مجھے چھوڑ کر سکھر میں کسی صاحب علم سے یہ کام لے سکتے ہیں، اس عاجز کے مشورے آپ کے ساتھ ہوں گے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

خواجہ جلیل احمد صاحب

۴ اکتوبر ۲۰۱۳ء

محترم جناب گرامی قدر خواجہ جلیل احمد صاحب سیکریٹری تنظیم فکر ونظر

السلام علیکم: مزاج شریف

تنظیم فکر ونظر سکھر کی طرف سے مجھے تنظیم کی ممبر شپ کا فارم ملا ہے اور خط میں درخواست کی گئی ہے کہ میں اس فارم کو پُر کرکے ارسال کردوں۔

فارم کے ایک حصہ میں تنظیم کے جو اغراض ومقاصد بیان کئے گئے ہیں، وہ یہ ہیں۔

(۱) سندھ کے اسلامی تشخص کو اجاگر کرنا۔

(۲) نظریہ پاکستان کے (یعنی اسلام) کے مطابق علمی وادبی سرگرمیوں کو منظّم کرنا۔

(۳) فرقیواریت، علاقائیت اور لادینیت کے حامل عناصر کی سرگرمیوں کی روک تھام کرنا۔

(۴) نئی نسل میں اسلامی اور ملی روح بیدار کرنا اور انہیں مسلمانوں کے شاندار ماضی سے آشنا کرنے کے لئے لٹریچر شائع کرتے رہنا۔

(۵) سندھی ادب میں مخالف اسلام اور مخالف پاکستان سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا اور ان کی روک تھام کے لئے کوشاں ہونا۔

(۸) اسلام اور پاکستان کے استحکام کے لئے کام کرنے والے ادیبوں اور محققوں کی حوصلہ افزائی کرنا، اسلامی ذہن رکھنے والے اہل علم اور اہل دانش کو منظّم کرکے مسلم دانشوروں کا حلقہ پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ۔

تنظیم کا ممبر بن کر، اس کے اغراض ومقاصد کے لئے کام کرنا، میرے لئے خوشی کا باعث ہوگا، لیکن پچھلے تیس سال سے تنظیم کی جو کارکردگی سامنے آئی ہے، وہ نہ صرف یہ کہ حوصلہ افزا نہیں، بلکہ بہت تشویشناک رہی ہے۔ باہمی تصادم، تنظیم کے اصل دعویدار کی حیثیت سے دوگروہوں کی طرف سے عدالتوں میں جاکر مقدمات کا چلتے رہنا، کام کے افراد کا ایک ایک کرکے تنظیم سے لاتعلق ہونا، طویل کوششوں کے بعد باہمی مصالحت ہوجانے کے باوجود دلوں میں موجود ایک دوسرے کے خلاف تلخیوں کا پھر ابھر کر سامنے

آنا، علمی، ادبی اور لٹریچر کے محاذ پر کام کے وعدے کرنے اور پروگرام بنانے کے باوجود عملی طور پر ایک قدم بھی پیش قدمی نہ کرنا، تنظیم کے موجودہ ممبروں میں ایک ممبر کا بھی ایسا نہ ہونا، جو سندھ کے نظریاتی چیلنج کا ادراک رکھنے کے ساتھ ان نظریاتی مسائل پر مضمون لکھنے کی صلاحیت کا حامل ہو۔

تنظیم کی مرکزی باڈی نے میرے ساتھ تحریری معاہدہ کیا تھا کہ تنظیم کی طرف سے علمی، ادبی اور نظریاتی لٹریچر کی تیاری واشاعت اور سندھ بھر کے علمی حلقوں تک ان کتابوں کی ترسیل کا کام محمد موسیٰ بھٹو صاحب کی طرف سے حیدرآباد سے ہوگا اور اس کے وسائل انہیں فراہم کئے جائیں گے۔ اس معاہدہ پر تنظیم کے ۱۵ عہدیداروں کے دستخط موجود ہیں۔

میں نے پانچ سات ماہ صرف کرکے، پانچ چھ کتابیں اشاعت کے لئے تیار بھی کر لی اور اپنے کاموں کو اوپر نیچے کرکے، تنظیم کی طرف سے پیش کردہ ذمہ داری کے لئے کافی وقت نکالا، لیکن معلوم ہوا کہ تنظیم کی یہ سب کاغذی کارروائی تھی اور تنظیم کے ذمہ دار حضرات کام کرنے کے سلسلہ میں نہ اس وقت سنجیدہ تھے اور نہ ہی اب اس سلسلہ میں سنجیدہ ہیں۔ جس تنظیم کو محض سندھ میں نظریاتی اور علمی کام کے لئے کروڑہا روپے ملے ہوں، بنیادی کام کے سلسلہ میں اس کے اس ''کردار'' کو افسوسناک اور تشویشناک ہی کہا جا سکتا ہے۔

سندھ نیشنل اکیڈمی، الحمدللہ پچھلے تیس سال سے علمی اور نظریاتی محاذ پر کام کررہی ہے، اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ دفتر میں کام کے سلسلہ میں کوئی ساتھی بھی موجود نہیں، وسائل اور ساتھی کے فقدان کے باوجود ہم نے الحمدللہ سندھی زبان میں ڈیڑھ سو سے زیادہ علمی کتابیں شائع کرکے، سندھ بھر کے علمی ادبی حلقوں تک پہنچائی اور ۲۲ سال سے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ''بیداری'' بھی پابندی سے شائع کرکے علمی حلقوں کو ارسال کرتے رہتے ہیں۔

جب کام کے سلسلہ میں اخلاص، سنجیدگی، اضطراب اور مستقل مزاجی ہو تو پھر اللہ کی مدد آتی ہے اور اس طرح کام ہوتا ہے۔

تنظیم وفکر ونظر کے پاس وسائل بھی موجود ہیں۔ دفتر میں عملہ بھی ہے، بڑا سینٹر

موجود ہے، سندھ بھر میں تنظیم کی شاخیں بھی موجود ہیں، اللہ نے وسائل اتنے دیئے ہیں کہ اگر ہر شاخ کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ نکال دیا جائے تو وسائل کی کمی حائل نہ ہوگی، لیکن کام کی بجائے باہمی رسہ کشی، دلوں میں موجود ایک دوسرے سے دوئی اور دوسرے ساتھیوں کو برداشت نہ کرنے کے رجحان، نے تو اب علمی حلقوں میں تنظیم کی جگ ہنسائی کی صورت پیدا کردی ہے۔

یہ ساری تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تنظیم کے دوستوں کے مسلسل اصرار پر میں نے تنظیم کی طرف سے علمی ونظریاتی کتابوں کی اشاعت وغیرہ کی ذمہ داری قبول کر لی تھی، لیکن ایک سال تک مسلسل خطوط لکھنے کے باوجود تنظیم کے ذمہ داروں کی طرف سے بے حسی اور کسی بھی خط کا جواب نہ ملنے سے میں نے یہ رائے قائم کر لی، اور اس رائے میں میں حق بجانب ہوں کہ تنظیم پچھلے تیس سال سے جس بے حسی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی جس روش پر گامزن رہی ہے، اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور عملی طور پر کام کرنے کے سلسلہ میں اس میں اب تک سنجیدگی پیدا نہیں ہوسکی ہے۔

ان حالات میں تنظیم کا ممبر بن کر تنظیم کا حصہ بننے میں مجھے افادیت کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا، بلکہ اس سے ایک تو میرے وقت کا ضیاع ہوگا، دوم تنظیم کی بے عملی کے نئے نئے واقعات آشکار ہوتے رہیں گے، جس سے دکھ ہوگا سوم تنظیم کے دوگروہوں کے درمیاں فریق بن کر اپنے آپ کو متنازع بنانے سے بچانا دشوار ہوگا۔

امید ہے کہ ان حالات میں تنظیم کا ممبر بننے سے مجھے معذور سمجھیں گے اور اپنے ادارہ کے لئے یکسو ہوکر، میں جو کام کررہا ہوں، وہ کام کرنے دیں گے۔

آپ کا از حد ممنوں ہوں۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

پروفیسر عبدالرحمٰن جتوئی صاحب

محترم جتوئی صاحب چالیس سال سے اشاعتی میدان میں کام کررہے ہیں اکثر اصلاحی کتابیں لکھتے رہے ہیں۔ اب پہلی بار منصوبہ بندی سے انہوں نے سندھ کے سیکولر فکر کے علمبرداروں پر تنقیدی کتابیں لانا شروع کی ہیں جو حوصلہ افزا بات ہے۔

۵ اگست ۲۰۱۳ء

محترم جناب پروفیسر عبدالرحمٰن جتوئی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

جی ایم سید کی فکر پر تنقیدی مضامین پر مشتمل آپ کی دوکتابیں مل گئی تھیں، اس کے بعد راجا داہر اور محمد بن قاسم کے موضوع پر بھی کتاب مل گئی ہے۔

آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ جی ایم سید کی گمراہ کن فکر پر (جس نے ہزارہا سندھی نوجوان کو گمراہ کیا ہے،) علمی تنقیدی مضامین جمع کرکے، از سرنو انہیں کتابی صورت میں شائع کررہے ہیں۔ میرے دومضامین ایسے تھے، جو مجھے یاد بھی نہیں تھے کہ میں نے لکھے ہیں، وہ بھی آپ نے شاید ہفتہ وار ''وینجھار'' کے پچیس تیس سالہ پہلے کے شماروں سے حاصل کرکے کتاب میں شامل کئے ہیں۔

جی ایم سید نے اپنی غلط فکر کی وجہ سے سندھ کی نسلوں کو جس بُری طرح متاثر کیا ہے، اس گمراہ کن فکر کے جواب میں سندھ کے اسلامی دانشوروں کے پرانے اخبارات اور رسائل یا پمفلٹوں میں موجود مواد کو جمع کرکے، کتابی صورت میں شایع کرنا بہت بڑی اسلامی خدمت ہے، جو آپ سرانجام دے رہے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ سندھ کا کوئی مکتبہ ایسا نہیں ہے، جو کتابیں رکھنے کے لئے تیار ہو، یہ بہت افسوسناک بلکہ تشویشناک صورتحال ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ فکری میدان میں پچھلے ساٹھ سال سے ہمارے ہاں نہ تو اسلامی فکری وادبی ادارے

وجود میں آئے اور نہ ہی تخلیقی ذہن رکھنے والے نوجوانوں کی تربیت کا کام ہو سکا، تنظیم فکر ونظر سکھر والوں کو سابق صدر ضیاء الحق کی طرف سے غیر معمولی مالی وسائل ملے، لیکن پچھلے تیس سال سے ان کی ساری توانائیاں آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں صرف ہورہی ہیں، اس عرصہ میں ان کی طرف سے کام کی مشکل سے دوچار کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

ضرورت تھی کہ سندھ کے علماء کرام کی طرف سے غلط فکر کا جواب دیا جاتا اور اس کا تعاقب ہوتا۔ سندھ میں پچھلے پچاس سال میں سیکولرزم اور لادینیت کے حق میں بلا مبالغہ سینکڑوں سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور سینکڑوں ادیبوں اور دانشوروں نے اپنی زندگی کا ہدف اس اسلام دشمن فکر کے فروغ کو بنایا ہے، کتنی دکھ کی بات ہے کہ ان ساری کتابوں کے جواب یا رد میں اب تک سندھی علماء کرام کی طرف سے کتاب تو کیا، ایک مضمون بھی نہیں لکھا گیا، ہمارے علمائے کرام کو آخرت میں اس کا جواب دینا پڑے گا۔ لادینیت کی ہمہ گیر فکر کی موجودگی میں خاموش تماشائی رہنا اور اپنے نوجوانوں کو خدا، رسول اور دین وایمان سے باغی ہوتے ہوئے دیکھکر خاموشی کا کوئی وجہ جواز نہیں ہوسکتا اس طرح کے حالات میں آپ خوش نصیب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق دی ہے۔

جی ایم سید کی کتاب ''جیسے میں نے دیکھا'' کے جواب میں راقم الحروف کی لکھی گئی علمی کتاب ''جس طرح میں نے دیکھا'' میرے پاس یہ کتاب ختم ہوگئی ہے۔ پچھلے پندرہ سال سے اس کتاب کا نیا ایڈیشن شائع نہ ہو سکا ہے، حالانکہ جی ایم سید کی مذکورہ کتاب ہر وقت مارکیٹ میں دستیاب ہے اور کئی ادارے اسے مسلسل شائع کررہے ہیں۔ آپ نے میری کتاب سے بعض مضامیں اپنی نئی کتاب میں شامل کرکے، اچھا کیا کہ میرے دلائل بھی پڑھنے والوں کے سامنے آجائیں گے۔

سندھ بھر کے اہل علم میں تقسیم کرنے کے لئے آپ مجھے آئندہ اپنی ہر کتاب کی سو کاپیاں بھیج دیا کریں، ان کی رقم میں آپ کی خدمت میں ارسال کردیا کروں گا۔ اس طریقہ سے ہمارے ادارہ کے ذریعہ آپ کی کتابیں اہل علم تک پہنچتی رہیں گی۔ ہمارا سارا کام توکل پر چل رہا ہے، وسائل کی کوئی مستقل صورت موجود نہیں، بعض اوقات تو

یہ حالت ہوتی ہے کہ سندھی بیداری پریس میں جانے کے لئے تیار ہوتا ہے، وسائل نہیں ہوتے، لیکن عین موقعہ پر اللہ کی طرف سے مدد کی صورت نکل آتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کا اخلاص، جذبہ، اضطراب، حوصلہ وہمت اور مستقل مزاجی کو دیکھتے ہیں، ان جذبات وصفات کے ساتھ اگر کام ہو تو بہت بڑے پیمانہ پر نہ سہی، کسی نہ کسی طور پر کام ہوتا رہے گا۔

ہماری عرصہ سے آرزو تھی کہ ہم نے جو کام حیدرآباد سے شروع کیا ہے، چھوٹے پیمانہ پر اسی انداز کا کام اندرون سندھ کے مختلف شہروں سے بھی ہو۔ الحمدللہ، آپ نے اس سلسلہ میں پیش قدمی کرکے، دوسروں کے لئے مثال قائم کی ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون ہو۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

ڈاکٹر صفی اللہ غزالی بھٹو

ڈاکٹر غزالی بڑے ذہین، عجز وانکساری کے حامل نوجوان ہیں اور اپنی ساری توانائیاں سماجی خدمت کے کاموں میں صرف کر دی ہیں۔

محترم ڈاکٹر صفی اللہ غزالی بھٹو صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

محترم لیاقت علی بھٹو صاحب نائب چیرمن تنظیم فکرونظر کا اصرار ہے کہ میں تنظیم کی ازسرنو ممبر سازی کے موجودہ مرحلہ میں تنظیم کا ممبر بن کر، تنظیم کے داخلی، انتشار کو ختم کرنے میں کردار ادا کروں۔

بات یہ ہے کہ افراد کی نفسیات اتنی پیچیدہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مزاج، مرضی اور مستحکم رائے کے خلاف بہتر سے بہتر نکات بھی سن کر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس معاملہ میں وہ عام طور پر اتنے حساس ہوتے ہیں کہ مرنے مارنے اور تصادم کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ تنظیموں، اداروں اور انجموں کے میرے چالیس سالہ تجربات یہی ہیں۔

پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب (تنظیم کے بانی) سے سب سے بڑی حکمت عملی کی جو غلطی ہوئی (جس کی وجہ سے وہ دل کے مریض ہو کر اللہ کو پیارے ہوئے اور تنظیم اب تک ان کی اس اجتہادی غلطی کے نتائج بھگت رہی ہے) وہ یہ ہے کہ علمی وادبی اداروں کے تقاضوں، اس کام کی نزاکت اور انسانی نفسیات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انہوں نے تنظیم کے دروازے ہر عام وخاص کے لئے کھول دیئے اور تنظیم کو، اسلامی جماعت کی صورت دے کر سندھ بھر میں اس کی شاخیں قائم کردیں۔ جب صدر ضیاء الحق صاحب کی طرف سے تنظیم کے ساتھ مالی تعاون ہوا تو تنظیم کے ذمہ داروں کے درمیاں ٹکراؤ شروع ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جب بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں علمی اور تحقیقی کام کے لئے ''دارالمصنفین'' کا ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو مولانا ابوالکلام

آزاد نے انہیں خط لکھا کہ ''دارالمصنفین'' میں علمی مزاج کے پانچ سات ممبران سے زیادہ ممبر نامزد نہ لیجئیگا ورنہ ادارہ خلفشار کا شکار ہوگا، اور علمی وتحقیقی کام سے زیادہ خلفشار سے بچنے میں توانائیاں صرف ہوں گی۔

تنظیم فکر وفکر پچھلے تیس سال سے جس بحران کا شکار ہے، اس بحران سے نکلنے کی مجھے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی، اس لئے کہ ایک تو تنظیم میں علمی مزاج کے حامل افراد نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دوم یہ کہ اجتماعی کاز کے لئے اپنے مفادات اور اپنی رائے سے دستبردار ہونے کا مزاج موجود نہیں، تنظیم کی نئی صورت گری سے بھی بحران کم ہونا دشوار تر ہے۔

اصولوں کی خلاف ورزی کے نتائج نکلے بغیر نہیں رہ سکتے۔ علمی وادبی ادارے زیادہ ممبر سازی کے متحمل ہرگز نہیں ہوتے۔

بہتری کی ایک ہی صورت ہے (اور کوئی صورت نظر نہیں آتی) وہ یہ ہے کہ تنظیم کے تین چار بڑے ذمہ داران، جن کے درمیاں بنیادی اختلافات موجود ہیں، وہ خوداحتسابی سے کام لیں اور اپنے اوپر اس احساس کو غالب کریں کہ ہمارے درمیاں عرصہ سے باہمی تنازع اور تصادم کی وجہ سے تنظیم کا سارا علمی وادبی کام رک گیا ہے، بے تحاشہ رقم ہونے کے باوجود سندھ کی نظریاتی کشمکش کی صورت میں ہم مثبت کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں، اگر ہم بیدار نہ ہوئے تو خدا کے سامنے ہمیں سخت جواب دہی کرنی ہوگی، وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے، عمر کے حساب سے اللہ کے سامنے ہماری حاضری اب کوئی زیادہ دور کی بات نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ ہم نے تمہیں دینی کام کے لئے اتنے وسائل دیئے تھے، تم نے ان کے صحیح استعمال کی بجائے اپنی قوتیں ایک دوسرے سے تصادم میں صرف کیں، کیوں؟ جواب دو۔

اس خود احتسابی اور مراقبہ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

باقی جہاں تک اس جذبہ کا تعلق ہے کہ تنظیم پر ایک نقطہ نظر کے حامل افراد مکمل طور پر غالب آجائیں، اس احساس اور جذبہ کی تکمیل نہیں ہوسکے گی۔ اس جذبہ کی وجہ سے ہی تو اب تک تعطل اور تصادم موجود ہے۔

ضرورت ہے کہ باہم ایک دوسرے کے ساتھ سلیقہ کے ساتھ رہنے اور کام

کرنے کی صورت اور گنجائش پیدا ہو، اور دلوں میں ایک دوسرے کے لئے وسعت پیدا کرنی کی کوشش ہو۔

محترم لیاقت صاحب اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو میرا یہ نکتہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کیجئیگا۔

محترم اسداللہ بھٹو صاحب کے فرزندوں میں اللہ نے آپ کو جو ذہانت، سنجیدگی، عاجزی صبر وتحمل، معاملہ کے سارے پہلوؤں کو دیکھکر رائے قائم کرنے کی جو صلاحیت عطا کی ہے، ایسی صلاحیت بہت کم افراد کو عطا ہوتی ہے۔

آپ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیتوں سے تنظیم کے معاملات کے لئے کچھ وقت نکالیں گے تو انشاء اللہ معاملہ کے سلجھاؤ کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

پروفیسر سکندر علی صاحب

پروفیسر سکندر علی صاحب دعوتی اعتبار سے متحرک انسان ہیں۔ کالج میں سینئر استاد ہیں۔ جہاں بھی رہتے ہیں، وہاں صحتمند سوچ کے حامل دوستوں کا حلقہ تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے تبدیلیٔ معاشرہ کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس عاجز کے ساتھ محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔

برادر عزیز پروفیسر سکندر علی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

آپ نے لکھا ہے کہ ہمارے ایک ذہین دوست نے تصوف کے موضوع پر آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، وہ آپ کے دلائل سے تو متفق ہیں، لیکن ان کا کہنا ہے کہ موسیٰ بھٹو صاحب کا بیان کردہ تصوف، آج سے صدیوں پہلے تو موجود تھا، لیکن اب یہ ساری باتیں کتابی نوعیت کی نظر آتی ہیں۔ اب ہمارے معاشرہ میں تصوف کی ایسی مثالی شخصیتیں موجود ہی نہیں، جو زہد اور دنیا سے استغنا کی صاحب ہوں، جو طالبوں کے مال پر نگاہ رکھنے سے محفوظ ہوں، اور جو جائداد واملاک بنانے اور مال جمع کرنے کی دوڑ اور اس کی حرص سے بلند ہوں۔

ہمارے ان دوست کا کہنا تھا کہ جب معاشرہ میں سرے سے سلف والا تصوف موجود ہی نہیں اور سیرت وکردار میں پہلے والے بزرگوں کی چمک ہی نہیں اور اب تصوف سراسر اپنے مریدوں کے حلقے مستحکم کرکے، ان سے مال بٹورنے، نااہل خلیفوں کی ٹیم درٹیم پیدا کرنے، مریدوں سے غلامی کے فرائض بجالانے اور ان سے اپنے تقدس کے گیت گانے اور اور لوگوں کو امت سے کاٹ کرکے، اپنی ذات سے وابستہ کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے تو ایسی صورت میں محمد موسیٰ بھٹو صاحب کی طرف سے تصوف کے حق میں مسلسل کتابیں لکھتے رہنا، کس افادیت کا حامل ہے، بلکہ دوست کا تو

کہنا تھا کہ تصوف واہل تصوف کو دلائل فراہم کرنے اور اس کی مسلسل حمایت ووکالت کرنے کی وجہ سے کہیں انہیں خدا کے سامنے جواب دہی نہ کرنی پڑے۔

ہمارا یہ دوست جس کا مشاہدہ اور مطالعہ وسیع ہے، اس نے تصوف کے نام پر ملک اور سندھ کی معروف شخصیتوں اور پیروں کے نام لئے اور مریدوں سے کمائی گئی، ان کی دولت کے واقعات بیان کئے۔

سندھ کے تین چار بڑے بزرگ جو موجودہ تصوف کی بڑی شخصیتیں سمجھی جاتی ہیں، جن کے مریدوں کی تعداد ان گنت ہے۔ ان کے بارے میں دوست کا کہنا تھا کہ وہ دولت سے کھیل رہے ہیں۔ بہترین گاڑیاں ہیں۔ زمین اور جائداد ہے، یہ ساری جائداد روحانیت کے نام پر ہی جمع ہوئی ہے، یہ پیر صاحبان اس دور کے نئے پیر ہیں، پرانے نہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اور عمل جو ان کے ہاں ہوتا ہے، جسے شرک ہی کہا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے ہر پروگرام میں بزرگ کے تقدس کا نقش مستحکم کرنے اور فنا فی الشیخ کے تصور کو غالب کرنے کے لئے بزرگ کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ ان قصیدوں میں بزرگ کی طرف خدا کی بیشتر صفات منسوب کی جاتی ہیں،ان بزرگوں کے مریدوں کی کوئی تقریب اور مراقبہ کا کوئی حلقہ بزرگوں کی شان میں اس طرح کے قصیدوں سے خالی نہیں ہوتا۔

دوست کا کہنا تھا کہ بھٹو صاحب کو زیب نہیں دیتا کہ وہ تصوف کے حق میں مسلسل کتابیں لکھکر، بالواسطہ طور پر اس طرح کے تصوف کو سہارا دیں اور اسے دلائل فراہم کریں۔ اور اصلاح کی خاطر لوگوں کو اس طرف ترغیب دیں۔

دوست کا موقف میں نے تفصیل سے اس لئے پیش کیا ہے، تاکہ اس سلسلہ میں آپ کا موقف واضح ہوسکے اور ہم اس طرح کے دوستوں کے سامنے آپ کی بات بہتر طور پر پیش کرسکیں۔

اس سلسلہ میں پہلی بات میں یہ عرض کروں گا کہ اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ قیامت تک ایسے لوگوں کو قائم رکھے گا،جو دین کا عملی نمونہ ہوں گے، زہد واستغنا کے صاحب ہوں گے اور دین کے داعی کی حیثیت سے کردار ادا کریں گے، اس طرح کی ایک حدیث شریف بھی موجود ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مجھے ایک عرصہ تک جس بزرگ کی صحبت حاصل تھی، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاںؒ، وہ سیرت وکردار میں سلف کازندہ نمونہ تھے، مریدوں سے خدمت لینے کی بجائے ان کی خدمت کرتے تھے۔ عاجزی وانکساری کا مجسمہ تھے، ضرورت سے زیادہ دولت اپنے پاس رہنے نہیں دیتے تھے، لباس اتنا سادہ پہنتے تھے کہ اس سے زیادہ سادہ لباس پہنتے ہوئے کم ہی کسی کو دیکھا ہے، غصہ اور اشتعال تو انہیں آتا ہی نہیں تھا، اپنے علاقہ میں سب سے زیادہ سادہ مکان انہی کا تھا، یونیورسٹی میں پروفیسر تھے، اپنی کم سے کم ضروریات کے علاوہ ساری رقم غریب مریدوں میں صرف کر دیتے تھے۔ ہر مرید سے ایسی محبت کرتے تھے اور اس والہانہ انداز سے ملتے تھے کہ ہر مرید یہ سمجھنے لگتا تھا کہ انہیں سب سے زیادہ محبت میرے ساتھ ہی ہے۔

بڑے سے بڑے قصور کو اس طرح معاف کردیتے تھے، گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ اپنے مریدوں میں اپنے رویے سے امت پن کے تصور کو اجاگر فرماتے تھے، دائراتی یا گروہی خولوں یا اپنے مرشد سے باہر موجود خیر کی انکار کے روش کے وہ سخت مخالف تھے۔

ان صفات کی حامل دوسری شخصیت جو میں نے دیکھی، وہ مولانا عبدالکریم بیروالوں کی شخصیت تھی۔ان کے مریدوں کی تعداد بھی ان گنت تھی، لیکن اس کے باوجود وہ کچے مکان میں رہتے تھے، ساری زندگی کچے مکان میں گذار دی، وہ ہر آنے والے کو ہر وقت دستیاب ہوتے تھے۔ وہ اپنے مریدوں میں امت پن کا مزاج مستحکم کرنے کے داعی تھے۔

ایک تیسری شخصیت،جو میں نے دیکھی،جسے سلف کی نشانی کہا جا سکتا ہے۔ وہ مانسرہ کے مولانا عبدالحی صاحب ہیں۔ وہ بھی سادگی اور زہد کا نمونہ ہیں۔ مریدوں اور اپنے درمیاں کوئی فاصلہ نہیں رکھتے، ہروقت دستیاب ہوتے ہیں۔ عاجزی وانکساری میں اپنی مثال آپ ہیں۔

اس طرح کے فقیر مشن بزرگ اور بھی معاشرہ میں موجود ہوں گے، جو تلاش سے مل سکتے ہیں، میری کتابوں میں جن اہل تصوف کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ اس طرح کی پاکیزہ شخصیتیں ہیں۔ تصوف کے نام پر کاروبار کو چمکانے یا تصوف کو اپنے تقدس کا نقش

بٹھانے اور مریدوں کو امت سے کاٹ کر، اپنا غلام بنانے کے حامل صوفیوں کی حمایت وکالت سے میں بری ہوں۔

میں نے جس جذبہ کے ساتھ یہ کتابیں لکھی ہیں، وہ جذبہ یہ ہے کہ حقیقی صاحبان دل سے تعلق کے نتیجہ میں فرد، اللہ کی محبت اور عشق کی وادی میں داخل ہوکر، نفس کی قوتوں کو آتش عشق میں جلانے کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، جس سے اسلامی شریعت پر عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

موجودہ دور میں تصوف میں جو بگاڑ آیا ہے، اس کا ایک سبب تو مادیت کا عالمگیر اور ہمہ گیر سیلاب ہے، یہ سیلاب مدرسوں اور خانقاہوں تک پہنچ گیا ہے۔ اس کا دوسرا بنیادی سبب یہ ہے کہ طالبوں کو فنائے نفس تک رسائی کے لئے پہلے جو غیرمعمولی مجاہدے کرا کر، خلافت دی جاتی تھی، اب بڑے پیمانہ پر اس کی خلافت ورزی ہوئی ہے اور غیرمعمولی مجاہدوں کے بغیر سرسری طور پر لطائف پر توجہ دینے کے بعد دوچار سال میں ہی خلافت دے دی جاتی ہے۔ چونکہ طالب کو حالت فنا سے حالت بقا نصیب نہیں ہوتی، اس لئے خلافت کے بعد نفس کی کدورتیں اور حب جاہ وحب مال کے جذبات سامنے آجاتے ہیں اور تصوف کے نام وہ سب کچھ ہونے لگتا ہے، جس کا اس وقت مظاہرہ ہورہا ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اصلاح فرمائے اور ہمیں جملہ خرابیوں سے بچائے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

جاوید صاحب

جاوید صاحب راہ سلوک کے طالب ہیں، ہمارے ساتھ چھ سات سال سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ درمیاں میں ان کے حالات کچھ خراب ہوگئے تھے، اس کے بعد الحمدللہ، ان کے باطنی حالات میں کافی بہتری آئی ہے۔ اور وہ ذکر ومراقبہ کے لئے کافی وقت دینے لگے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی خوداعتمادی میں اضافہ ہورہا ہے۔

۱۲ اپریل ۲۰۱۲ء

عزیز محترم جاوید صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

آپ پر دوبارہ ڈپریشن کے غلبہ کی حالت کا سن کر افسوس ہوا، آپ کی اہلیہ نے بتایا کہ گھر سے نکلتے نہیں۔ فرائض کی پابندی بھی متاثر ہے، نفسیاتی ماہر ڈاکٹر کی دوچار ماہ سے دوا استعمال کررہے ہیں، لیکن کوئی خاص فائدہ نہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے۔

ڈپریشن کے بارے میں میں نے آپ سے کئی بار عرض کیا ہے کہ یہ انسانی شخصیت میں موجود اصل ہستی روح کی حالت اشتعال ہے، جو وہ دماغ اور دل کی طرف منتقل کرتا ہے، روح کی اس حالت اشتعال سے دماغ عجیب قسم کی الجھنوں، دباؤ اور زندگی کے بارے میں یاس کا شکار ہوجاتا ہے۔ مغربی ملکوں میں یہ بیماری بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، وہاں کا ہر دوسرا فرد، کسی نہ کسی حد تک اس بیماری کا شکار ہے۔ مغربی ماہر، انسان کی ساخت اور اس کی اصل حیثیت ونوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اسے مادی اور جسمانی نوعیت کی بیماری سمجھکر، اس کا علاج کررہے ہیں، ڈپریشن کے علاج کے لئے مغربی ماہرین دن رات تلاش میں مصروف ہیں، مگر اب تک چار پانچ گولیوں سے زیادہ دوائیں ایجاد نہ کرسکے ہیں۔ ساری کمپنیاں انہی دواؤں کو مختلف ناموں سے مارکیٹ میں لارہی ہیں، لیکن ان دواؤں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ دماغ کو سلانے کا کردار ادا

کرتی ہیں اور اعصاب کو بے حس بنا دیتی ہیں۔ ان دواؤں کے چند ماہ تک استعمال کے بعد فرد کے دماغ اور اعصاب میں دوچار ماہ کے لئے چستی اور توانائی آجاتی ہے، لیکن مریض پر پھر دوبارہ اور سہ بارہ بیماری کا حملہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح کے بیسیوں مریضوں کو جانتے ہیں، جو ان دواؤں کا استعمال کرتے رہتے ہیں، لیکن وقتی فائدہ سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔

اہل مغرب کا انسانیت پر یہ سب سے بڑا ظلم ہے کہ اس نے انسانیت سے روحانی اور پاکیزہ اخلاقی اقدار چھیننے اور انہیں دین ومذہب سے عاری اور باغی بنانے اور ان پر ہمہ وقت مادیت کا جنون سوار کرنے اور اس کی اصلیت کو حیوانیت سے مشابہت دینے کے نظریات کے فروغ کے ذریعہ اس نے انسانیت کو بے تحاشہ روحانی بیماریوں میں مبتلا کردیا ہے اور روح کا واحد سہارا جو روح مطلق ہستی ہے، اس سے اس کا مکمل طور پر تعلق توڑ دیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ انسانیت مادی زندگی میں استغراق اور بہتر مادی مستقبل کی جدوجہد میں ایک دوسرے کو پامال کرکے، ان سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں شریک ہوکر، بے پناہ ذہنی ونفسیاتی بیماریوں کا شکار ہے۔

مادیت کے ہمہ گیر غلبہ کی وجہ سے موجودہ دور کے انسان کو یہ نکتہ سمجھانے میں سخت دشواری ہورہی ہے کہ اس کی محرومیوں، ذہنی دباؤ اور نفسیاتی نوعیت کے سارے مسائل اس لئے ہیں کہ انسانی شخصیت میں موجود اصل ہستی، روح کو اس کی غذا دینے کا عمل بند کر دیا گیا ہے۔ روح نے ایک بار عالم امر میں کائنات کے سارے حسن کی خالق ہستی کا مشاہدہ کیا ہے، مادی جسم کے ساتھ اب اس طرح کا مشاہدہ اس دنیا میں ممکن نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی شخصیت میں روح کے ساتھ ساتھ دل کی جوہری قوت رکھی ہے، جو روح دماغ اور مادی نفس کے درمیاں رابطہ کا بھی ذریعہ ہے۔ یہی دل، انوار الٰہی کے اخذ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے، دل یہی انوار، روح دماغ اور نفس کی طرف بھی منتقل کرتا رہتا ہے، جس سے ساری انسانی شخصیت سکوں، سکینت، طمانیت اور لذت وحلاوت سے سرشار ہونے لگتی ہے اور ڈپریشن، مایوسی، بے یقینی، دنیا پر ٹوٹ پڑنے کی نفسیات، انتقام لینے کی نفسیات اور اور ذہنی دباؤ جیسے مسائل سرے سے پیدا ہی نہیں ہوپاتے، اس لئے کہ حسن کی خالق ہستی کے ذکر کے تکرار سے حسن کی تجلیات دل، ذہن اور ساری انسانی شخصیت کو متوازن بنادیتی ہے، دل کی رفتار میں

تیزی یا کمی کو ختم کرکے، اس کو متوازن کردیتی ہے۔ دماغ کو پاکیزہ خیالات وسوچ سے بھرپور کردیتی ہے۔ اس طرح انسانی نفسیات، انسانیت کے شایانِ شان ہوجاتی ہے۔

دل کی، انوار ذکر سے محرومی، ایک نہیں، بے شمار بیماریوں کا موجب ہے۔ **فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ**، ہلاکت ہے ان کے لئے جن کے دل اللہ کے ذکر کے سلسلہ میں سخت ہیں۔ یعنی اللہ کے ذکر کی طرف آنے کے لئے تیار ہی نہیں۔

آپ جب پہلی بار میرے پاس آئے تھے تو آپ کا ڈپریشن آخری مرحلہ تک پہنچ چکا تھا، زندگی سے بیزاری کا رنگ آپ پر غالب تھا، آپ بات کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔ الحمدللہ، آپ نے روزانہ آمدورفت کا سلسلہ شروع کیا اور مراقبہ کا عمل جاری رکھا تو دوچار ماہ کے اندر اندر ڈپریشن کے اثرات غائب ہوگئے۔ آپ کا تین چارسال تک مراقبہ کا عمل روزانہ تین گھنٹے تک پہنچ چکا تھا۔ جس سے آپ نے خوشی ومسرت کی نئی زندگی محسوس کی، پھر کراچی منتقل ہونے کے بعد آپ نے صحبت ورابطہ میں غیرمعمولی سستی کا مظاہرہ کیا، جس سے آپ کے مراقبہ کا دورانیہ برائے نام رہ گیا اور آپ پھر ڈپریشن کا شکار ہوگئے۔ حوصلہ اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ مراقبہ کے سلسلہ کو پھر شروع کریں۔ لیکن اس کے لئے صحبت ورابط کی سخت ضرورت ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ نے لکھا ہے کہ طالب کو جب تک ذکر ومراقبہ میں رسوخ حاصل نہ ہو یعنی جب تک ذکر سے طبعی مناسبت پیدا نہ ہو اور فنا کا مقام حاصل نہ ہو، تب تک اسے اپنے مربی سے جدائی اختیار نہیں کرنی چاہئے۔ ورنہ وہ گرنا شروع ہوجائے گا۔

مراقبہ کے زندگی پر پڑنے والے صحتمند اثرات کے بارے میں آپ کو مزید کیا تلقین کریں، اس لئے کہ آپ تین چار سال تک اس کے غیرمعمولی فوائد کا اپنی زندگی میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اب صرف ہمت وحوصلہ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

ڈاکٹر محمد طاہر صاحب

ڈاکٹر محمد طاہر صاحب ایلوپیتھک اور ہیومیوپیتھ ڈاکٹر ہیں۔ ساتھ ساتھ حکیم بھی ہیں، عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب، ملک کے ذہین ترین افراد میں شامل ہیں، مطالعہ کے شوقین ہیں۔ تصوف اور فکر کی دنیا کا وسیع مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب عصر حاضر کے میلات ورجحات اور دور جدید کے مادی انسان کے مسائل اور ان کی نوعیت کو سمجھنے اور اس معاملہ میں اس کی رہنمائی کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں۔ کچھ وقت سے موصوف راہ سلوک میں چل رہے ہیں، اور روزانہ کئی گھنٹے ذکر ومراقبہ میں صرف کرتے ہیں ان کی طلب اور اضطراب کو دیکھتے ہوئے انہیں یہ تفصیلی خط لکھا گیا ہے، جو انشاء اللہ دوسرے طالبوں کے لئے بھی حوصلہ افزا ثابت ہوگا۔

۵ ستمبر ۲۰۱۳ء

محترم جناب ڈاکٹر محمد طاہر صاحب

السلام علیکم مزاج شریف

راہ محبت میں سفر کے سلسلہ میں ہر مخلص طالب اور سالک کی طرح جو مشکلات آپ کو درپیش آرہی ہیں، ان کا حوصلہ اور ہمت سے مقابلہ کرتے ہوئے، اس راہ میں چلتے رہنا اور راہ محبت سے دستکش ہونے کے فراری وسوسوں کو غالب نہ آنے دینا، یہ اس راہ میں طالب کا سب سے بڑا امتحان ہے، ایک تو قبض کے تیر ہوتے ہیں، جو طالب کے اندرونی نظام کو وقتی طور پر درہم برہم کرتے رہتے ہیں، دوم نفس وشیطان کی طرف سے مسلسل یہ وسوسہ اور خیال ڈال دیا جاتا ہے کہ راہ محبت، مصائب ومشکلات سے بھرپور ہے۔ دن بھر کے ذکر وفکر کے مجاہدوں کے باوجود نہ تو کیفیات کے مدوجزر میں کمی آتی ہے اور نہ ہی نماز اور اسلامی شریعت کے احکامات پر عمل پیرا ہونے میں

آسانی ہوتی ہے، نماز کے لئے بھی بعض اوقات نفس کو جبرا ہی آمادہ کرنا پڑتا ہے۔

اس طرح کی مشکلات سے گھبرا کر، اکثر طالب راہ فرار اختیار کرلیتے ہیں۔ ایسے بیسیوں طالبوں کو دیکھا ہے، جو بڑے جذبہ سے چل رہے تھے، لیکن نفس وشیطان کے اغوئ اور مشکلات سے گھبرا کر راہ محبت سے دستکش ہوگئے۔

آپ کو ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ نے استقامت نصیب فرمائی ہے اور آپ ہر طرح کے حالات میں مستقل مزاجی سے چل رہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے راہیں کھول دے اور مشکلات کو آسان کردے۔

اگر راہ محبت کے بنیادی تقاضوں کو سمجھ لیا جائے تو ان شاء اللہ نفس وشیطان کے اغوئ اور ان کی فریب کاریوں سے آشنائی ہوگی اور ان شاء اللہ بچنے کی صورت بھی اللہ تعالیٰ پیدا کردے گا۔

اللہ کی محبت کے حقیقی طالب کے ساتھ اللہ کا ایک معاملہ تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل کو دنیا سے بے نیاز کرکے، لوگوں سے بھرپور تعلقات سے آزاد کرکے، دل کے جذبات کو دولت وغیرہ کے جذبات سے سرد کرکے، اپنی راہ میں چلاتا ہے۔ محبوب حقیقی کی طرف سے مخلص طالب کے لئے روزی کی انتظام اس طرح کردیا جاتا ہے کہ بظاہر اسباب میسر نہ ہونے کے باوجود اس کی ہر ضرورت کی تکمیل کی صورت پیدا کردی جاتی ہے۔ طالب کو زندگی کے ہر موڑ پر اس کا تجربہ ومشاہدہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ابتلا وآزمائش کی خاطر بعض اوقات تنگی کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے، لیکن اس طرح کے مواقع پر طالب کے دل کو غنی کر دیا جاتا ہے اور اس پر صبر وشکر کی نفسیات غالب کر دی جاتی ہیں۔

موجودہ دور میں جب کہ ہر فرد، دولت ودنیا کے بارے میں سخت پریشان ہے اور اپنے معاشی مستقبل کے سلسلہ میں شدید مضطرب ہے۔ غریب ہو یا امیر، اس سلسلہ میں سب کی حالت یکساں ہے، اس طرح کی صورتحال میں دولت اور دنیا کے بارے میں طالب کے دل کو غنی اور بے نیاز کر دینا، محبوب حقیقی کی بہت بڑی نعمت ہے، جس کی طالب کو قدر کرنی چاہئے۔

فنائے نفس کے مقام تک رسائی تک طالب کے ساتھ محبوب کا معاملہ یہ ہوتا ہے

کہ اس کی دل، نفسیات اور مزاج میں محبوب کے لئے بے قراری و بے تابی کی حالت غالب رہتی ہے۔ محبوب کے ذکر، محبوب کی محبت کے اسرار ورموز، نفس کے مدوجزر، راہ سلوک کے مسائل، محبوب کے لئے مرمٹنے کی باتوں، عاشقوں کے حالات اور بزرگوں کی ملفوظات اور محبوب کی اطاعت کے علاوہ دوسری باتوں اور دوسرے کاموں سے اس کی طبعی رغبت اور مناسبت باقی نہیں رہتی، اگرچہ طالب، دنیاوی ضروریات کے معاملات بے دلی کے ساتھ سرانجام دینے پر مجبور ہوتا ہے، لیکن اس کا دل محبوب کے انوار حسن کا بھوکا ہوتا ہے اور شب روز یہی فکر اسے گھیرے رہتی ہے۔

محبوب حقیقی اپنے مخلص طالبوں کے خون میں اپنے لئے حرارت وحدت پیدا کردیتا ہے۔ اور اپنے لئے نیم مدہوشی کی حالت طاری کردیتا ہے۔ جسے اصطلاح میں حالت سکر کہتے ہیں۔ فنائے نفس سے پہلے حالت سکر سے نکلنے کے سارے راستے بند کردیئے جاتے ہیں۔ حالت سکر کا یہ راستہ آسانی سے طے نہیں ہوتا، اس میں کافی وقت لگتا ہے۔ دس پندرہ بیس سال سے پہلے یہ راستہ طے نہیں ہوتا۔ البتہ عام لوگوں کا سلوک اس سے مختلف ہوتا ہے، ان کے لئے روزانہ آدھے گھنٹے سے ایک گھنٹہ تک کا ذکر وفکر اور صحبت کا اہتمام کافی ہے، اس سے چند سالوں کے اندر ان میں اتنی استعداد پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے نفس کی پوری طرح نگرانی کرسکیں اور نفس کے بڑے بڑے فتنوں سے بچ سکیں، لیکن جن خوش نصیبوں کے لئے باقاعدہ سلوک طے کرنا لکھا گیا ہوتا ہے یا جن کو یہ توفیق عطا ہوتی ہے، انہیں حالت سکر میں رہ کر ہی محبوب کی خاطر دنیا کی ساری مصروفیات اس کے تابع کرنا پڑتی ہیں۔

طالب کو ایک تو ذکر وفکر کے لئے کافی وقت دینا ہوتا ہے، یہ اس کا وظیفہ حیات ہوتا ہے، دوم ذکر وفکر میں پیدا ہونے والے جمود کو ختم کرکے، ذوق وشوق کی فضا پیدا کرنے کے لئے مربی کی صحبت اختیار کرنی پڑتی ہے، صحبت ورابطہ بھی بنیادی چیز ہے۔ اس لئے کہ اس کے بغیر طالب کے لئے تعطل سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔

تیسری اہم چیز جس سے طالب کو مسلسل سابقہ درپیش ہوتا ہے، وہ قبض وبسط کی کیفیات ہیں۔ جن سے طالب کو عرصہ تک گزرنا پڑتا ہے۔ طالب کے نفس کی سرکشی اور اس کے زور کو توڑنے کے لئے محبوب کے جلالی صفات کے عکسوں کا دل ونفس پر مسلسل گرتے رہنا اور اس جلال کے معا بعد جمالی صفات کے عکسوں کا ورود ہونا، یہ راہ سلوک

کے لوازمات میں سے ہے، طالب کو قبض وبسط کے مراحل سے گزرے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ جب طالب پر قبض کی کیفیت غالب ہوتی ہے تو وہ دل پر انگارے گرتے ہوئے محسوس کرتا ہے، جس سے وہ بے چین ہوجاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔ اس کی یہ بے چینی قابل رحم حد تک ہوتی ہے، لیکن جب محبوب کی طرف سے اس کے دل پر جمالی صفت کے عکس کا ورود ہوتا ہے تو وہ خوشی ومسرت کے بے پناہ احساسات سے سرشار ہونے لگتا ہے، اس طرح کی خوشی جس کا تصور دنیا میں اس سے بڑھکر کیا ہی نہیں جا سکتا۔

جلالی وجمالی صفات کے عکس کے درمیاں ہی طالب کی تربیت واصلاح کا عمل جاری رہتا ہے۔ جب نفس کی سرکشی کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور تہذیب نفس کا عمل بڑی حد تک مکمل ہوجاتا ہے، جسے اصطلاح میں فنا فی اللہ کہا جاتا ہے تو اسے بقا کی حالت نصیب ہوتی ہے۔ اب جلالی تجلیات سے بڑی حد تک معافی نصیب ہوتی ہے۔ اور دست بکار دل بیار یعنی ہاتھ کام میں دل محبوب میں والی حالت عطا ہوتی ہے۔

اب خلق سے رابطے، خدمت دین کے کاموں سے طبعی مناسبت پیدا ہونے لگتی ہے، اس لئے کہ اب نفس کی غلامی سے بڑی حد تک آزادی نصیب ہوگئی اور اخلاص کی دولت حاصل ہوگئی اور اب ان سارے کاموں سے مقصود محبوب حقیقی کی رضامندی ہوتی ہے۔

طالب کو مجاہدوں کے دوران یعنی دورانِ سلوک ہی راہ محبت کے ثمرات ملنا شروع ہوجاتے ہیں، مثلا وقت میں برکت، علم میں برکت، فراست اور حکمت کا عطا ہونا، اندر کے مفتی کی بیداری وغیرہ لیکن تکمیل سلوک یعنی فنائے نفس کے بعد جب وہ حالت بقا میں آتا ہے تو اس وقت محبوب کی طرف سے اسے جو نعمتیں ملتی ہیں۔ وہ ایسی ہیں، جنہیں الفاظ میں بیاں کرنا دشوار ہے۔ مولانا رومی نے فرمایا ہے، طالب سے ایک زندگی چھین کر اسے (آخر میں) سو نئی زندگیاں عطا کی جاتی ہیں۔

ان نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ دین کے بارے میں حساسیت اور اسلامی حمیت اس کا مزاج بن جاتا ہے۔ اسلامی شریعت کے چھوٹے سے چھوٹے حکم پر بھی اس کے عمل کی استعداد قوی ہوجاتی ہے۔ دوسری نعمت جو اسے عطا ہوتی ہے، وہ انسانی جوہروں سے بہرہ وری کی نعمت ہے یعنی سیرت وکردار کی پاکیزگی کی نعمت اسے

عطا کی جاتی ہے۔ غصہ اور اشتعال بڑی حد تک نکل جاتا ہے۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ والہانہ محبت اس کے مزاج میں داخل ہوجاتی ہے، اللہ کی مخلوق کی پریشانیوں سے وہ غم زدہ ہوجاتا ہے۔ آخرت کی فکر اس پر دامنگیر رہتی ہے، وہ از حد فکرمند ہوجاتا ہے کہ معلوم نہیں آخرت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔

راہ محبت اور راہ سلوک طے ہونے کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ان نعمتوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دس پندرہ بیس سال کے مجاہدے اور آتش عشق میں جلنے کی یہ قربانی کوئی زیادہ قربانی نہیں ہے، زیادہ مہنگا سودا نہیں، ان مجاہدوں کے نتیجہ میں محبوب اپنے فضل خاص سے طالب کو جو انعامات عطا فرماتا ہے وہ بے پناہ ہیں، **الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَكَانُواْ يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الآخِرَةِ.** جو مومن و متقی ہیں ان کے لئے اس دنیا میں بھی خوش خبری ہے تو آخرت میں بھی خوش خبری ہوگی۔

يُثَبِّتُ اللّهُ الَّذِيْنَ آمَنُواْ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الآخِرَةِ . اللہ تعالیٰ مومنوں کو ثابت قدم رکھے گا اس قول ثابت کی بدولت، دنیا میں بھی تو آخرت میں بھی۔

لِّلَّذِيْنَ أَحْسَنُواْ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الآخِرَةِ.

نیکوکاروں کے لئے اس دنیا میں بھی بہتری ہے تو آخرت میں بھی مزید بہتری ہوگی۔

آپ کے محبت کے سفر کو فروزاں تر کرنے، ذکر کے لئے آپ کے ذوق وشوق کو قائم رکھنے اور ادلتی بدلتی ہوئی روزہ مرہ کی کیفیات میں مستحکم رہنے کی خاطر یہ چند سطور لکھی ہیں۔ انشاء اللہ اس سے آپ کو تسکین ملے گی۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام
احقر
محمد موسیٰ بھٹو

عبدالرشید صاحب

عبدالرشید صاحب کمپیوٹر کا کاروبار کرتے ہیں۔ دنیا بھر گھومی ہے، وسیع تجربہ ومشاہدہ کی حامل شخصیت ہیں۔ وہ کافی عرصہ سے روحانی طور پر ایسی شخصیت کی تلاش میں رہے ہیں، جو ان کی مشاہداتی، ذہنی اور علمی سطح کے مطابق تصوف کے حوالے سے اس کی علمی طور پر تشفی بھی کرسکے تو انہیں زیادہ سے زیادہ وقت بھی دے سکے۔

۳ اگست ۲۰۱۳ء
محترم جناب عبدالرشید صاحب
السلام علیکم : مزاج شریف

آپ کی یہ روئداد بڑی عجیب غریب ہے کہ آپ برسوں سے مروجہ بزرگوں کی صحبت میں جاتے رہے، لیکن تصوف، اس کی روایات اور خانقاہوں میں مریدوں کی طرف سے غلو سے بھرپور رویوں کی آپ نہ تو توجیہ کرسکے اور نہ ہی اس سلسلہ میں آپ کو مطمئن کرنے کی صورت پیدا ہوسکی، روحانیت کی تلاش نے آپ کو عیسائیت کی راہبہ عمر رسیدہ خاتون کے ہاں پہنچایا، جس نے آپ کو غیرشعوری طور پر اپنے مذہب میں داخل کرکے، آپ کو روحانی سبق دیا۔ جس سے آپ کو کچھ سکون ملنا شروع ہوا۔ آپ دوبارہ اس عورت کے پاس گئے، اس نے آپ کو دوسرا سبق بھی دیا، جس سے آپ نے مزید روحانی طمانیت محسوس کی، لیکن آپ نے اپنے ایک دوست کو یہ تفصیل سنائی تو اس نے آپ کی صحیح علمی رہنمائی کی اور آپ سے کہا کہ اس عورت سے روحانی طور پر وابستہ ہوکر، تم غیرشعوری طور پر اسلام کی سرحدوں سے نکل چکے ہو، اب توبہ تائب ہوکر، تجدید ایمان کرلو۔ اس طرح اللہ نے آپ کو عیسائی راہبہ کے چنگل سے نکالا۔

موجودہ دور میں بدقسمتی سے اہل تصوف سے علم بڑی حد تک رخصت ہو چکا ہے، ان کے ہاں بزرگوں کی کرامات اور کشف، ان کے مشاہدوں کی کہانیوں کے واقعات

ہی رہ گئے ہیں، جس سے وہ اپنے مریدوں کو بہلاتے رہتے ہیں، ذہین افراد کو تصوف کے حوالے سے مطمئن کرنا اور اہل تصوف کے بعض رویوں کے بارے میں ان کے ذہنی اشکالات کو دور کرنے کی صلاحیت مروجہ تصوف میں نہ ہونے کے برابر ہے، جس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ سخت پریشان ہے اور وہ روحانی طور پر شدید مضطرب بھی ہے۔

آپ قاضی غیاث صاحب کے ساتھ مجھ سے محض ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے، لیکن آپ کی طلب کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپ کے سارے اشکالات دور کرکے، آپ کو راہ محبت میں چلنے کی سعادت عطا فرمائی۔

جہاں تک خالی روحانیت کا تعلق ہے تو دوسرے مذاہب کے ہاں بھی اس کی تسکین کا انتظام موجود ہے، لیکن اسلام محض روحانیت کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد توحید ورسالت اور آخرت کے عقیدوں پر مشتمل ہیں۔ اگر عقیدوں کی بنیاد صحیح نہیں تو ایسی روحانیت آخرت میں قابل قبول نہ ہوگی۔ دوسری چیز اسلامی شریعت ہے، اسلامی شریعت اور اس کی تعلیمات اور بنیادی فرائض کی بجا آوری کے بغیر بھی روحانیت کی کوئی حیثیت نہیں۔

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيْناً (جو شخص اسلام کے علاوہ دوسرے دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا) **إِنَّ الدِّيْنَ عِندَ اللّهِ الإِسْلاَمِ** . (اللہ کے ہاں قابل قبول دین تو اسلام ہی ہے)۔

حدیثِ جبرئیل کے نام سے ایک مشہور حدیث ہے، جو آپ نے ضرور سنی ہوگی، جس میں ایمان، اسلام اور احسان تینوں کا ذکر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان تینوں کے مجموعہ سے ہی اسلام کی تکمیل ہوتی ہے، ان تینوں میں سے کسی ایک حصہ کی بھی کمی سے فرد کا ایمان نامکمل ہوجاتا ہے۔

یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے باقائدہ مراقبہ شروع کیا ہے، اور دن میں مختلف اوقات میں آپ کا ذکر ومراقبہ ہوتا رہتا ہے، جس سے آپ نے اپنی زندگی میں غیرمعمولی روحانی تسکین محسوس کی ہے، اور بُرائیوں سے بچنے کی استعداد تیزی سے پیدا ہوتی جارہی ہے، خوداعتمادی، رواداری، اور جذبات محبت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

یہ سب آپ کی حقیقی طلب کا نتیجہ ہے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ فرد اپنے اندر

حقیقی طلب پیدا کردے، اللہ کی محبت کے اجزاء سے بہرہ وری کے لئے بے تاب ہوجائے تو روحانی استاد اسے اس آسانی سے دستیاب ہوگا کہ اس کے گھر پر آکر اس کی رہنمائی کرے گا۔

اسلام اپنے احکامات، تعلیمات اور قوانین پر مشتمل معاشرہ کی جو تشکیل کرنا چاہتا ہے، اس میں ذکروفکر وعبادت کی حیثیت بنیاد کی سی ہے۔ اگر یہ بنیاد کمزور ہے تو اسلامی معاشرہ متشکل ہوکر، مضبوط ہو سکے، ممکن نہیں، اس لئے کہ حسن وجمال کی خالق ہستی کے نام کے تکرار کے ذریعہ ہی حسین صفات پیدا ہوسکتی ہیں اور سیرت وکردار میں پاکیزگی پیدا ہوسکتی ہے، نفس کی قوت کو مفلوج کرکے، اسے مکمل طور پر اللہ کی اطاعت میں دینے کی استعداد اللہ کے کثرت کے ساتھ ذکر میں ہی ہے، اس لئے **یاایھاالذین اٰمنوالذکرو**. کا حکم دیا گیا ہے۔

روزانہ ذکر ومراقبہ کے لئے صبح کے علاوہ شام کے وقت بھی وقت نکالتے رہنا ضروری ہے، اس سے ذکر کے ملکہ میں استحکام پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ فرد کے پاس جو بھی فارغ وقت ہوگا، دل اسے مجبور کرے گا کہ مجھ سے ذکر کراؤ اور مجھے محبوب کے انوارحسن سے متمتع کرو، اس کے بعد یہ حالت ہوجائے گی کہ جو وقت ذکر کے بغیر گزرے گا، اس پر دل شدید اذیت محسوس کرے گا۔ اس طرح فرد، کام سے فارغ ہونے کے فورا بعد محبوب سے راز ونیاز کی حالت میں چلا جائے گا۔ وہ جو حدیث شریف ہے کہ آخرت میں بندہ مومن کو کوئی حسرت نہ ہوگی، سوائے اس کے کہ دنیا میں اس کا جو وقت ذکر کے بغیر گذرا، وہ کیوں گذرا۔

مبتدی ومتوسط کی ساری ترقی کثرت ذکر اور صحبت کے ذریعہ ہی ہوتی ہے، جب کہ منتہی سالک کا دعوتی کام اور خدمت خلق کا کام خود ذکر میں شامل ہوجاتا ہے، اس لئے کہ غیرمعمولی مجاہدوں کی برکت سے اسے اخلاص اور تعلق مع اللہ کا مستقل مقام حاصل ہوجاتا ہے۔

مزید تفصیل انشاء اللہ روبرو بیان ہوگی۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۲ستمبر۲۰۱۳ء

عزیزم عبدالرشید صاحب

السلام علیکم مزاج شریف

راہ سلوک میں طالب کی ساری جدوجہد نفس کے خلاف ہوتی ہے۔ ہر شخص کا نفس عام طور پر اس طالب کی طرح ہوتا ہے، جس کا ذکر ایک بزرگ کی کتاب میں پڑھا تھا کہ وہ طالب دور دراز کا سفر کرکے ایک بزرگ سے نفس کی اصلاح کے سلسلہ میں آیا، بزرگ نے اسے ذکر کا پہلا سبق دیا اور کہا کہ اس پر خوب محنت کرو، وہ چند دن خانقاہ میں مقیم ہوا، اس کے بعد وہ واپس چلا گیا، اس نے ذکر پر یعنی پہلے سبق پر کافی محنت کی۔ سال بھر کے بعد وہ اگلا سبق لینے کے لئے آیا۔ اسی طرح وہ تیسرے سال اور چوتھے سال بھی آگے کے اسباق کے لئے آتا رہا، جب ذکر کے اسباق پر اس کی محنت قابل ذکر حد تک ہوئی اور وہ آخر میں بزرگ سے ملاقات کے لئے آیا تو اس نے بزرگ سے کہا کہ اگر اجازت ہو اور عتاب نہ ہوتو ایک عرض کردوں، بزرگ نے کہا کہ بلاتکلف بات کریں، اس نے کہا کہ جب میں آپ سے پہلی بار ذکر لینے کے لئے آیا تھا تو آپ کے دل کے آئینہ میں مجھ پر آپ کی جو شکل منکشف ہوئی، وہ خنزیر کی شکل سے مشابہت رکھتی تھی۔ جب دوسری بار ذکر لینے کے لئے آیا تو اب کی بار آپ کی شکل جو مجھ پر آپ کے دل کے آئینہ پر ظاہر ہوئی، وہ شیر کی شکل تھی، جب تیسری بار میں خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے مجھے اگلا سبق دیا تو اس وقت مجھ پر آپ کی جو شکل منکشف ہوئی، وہ لومڑی کی شکل تھی۔ چوتھی بار آپ کی شکل کتے کی شکل میں محسوس ہوئی، پانچویں بار گدھے کی صورت میں، آخری بار جب میں حاضر ہوا ہوں تو اب میں آپ کے دل کے آئینہ میں آپ کی جو شکل دیکھتا ہوں، وہ ایک بہتر انسان کی شکل ہے۔

بزرگ نے ان سے کہا کہ آپ نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ دراصل میرے دل کے آئینہ میں آپ کی شکل تھی، پہلی بار جب آئے تھے تو آپ کے اعمال اس جانور سے ملتے جلتے تھے۔ دوسری بار جب آئے تو آپ کی حالت میں کچھ تغیر آیا۔ مسلسل

ذکر کے مجاہدوں کی برکت سے اب جا کر آپ کے اعمال کی نوعیت انسان کے شایانِ شان ہوگئی ہے۔ آپ صحیح معنیٰ میں اب انسان ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن میں ایک جگہ ہے **أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا.** کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے خواہشات کو خدا بنالیا ہے، کیا تم اس کے وکیل ہو سکتے ہو یا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور عقل سے کام لیتے ہیں (نہیں) بلکہ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔

ایک اور جگہ ہے۔

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ (اس کی مثال کتے کی سی ہوگئی)۔

بہت زیادہ فکرمندی کی ضرورت ہے کہ اپنے آپ کو جانورانہ ''خصلتوں'' سے بچاکر، بہتر انسان اور پاکیزہ انسان بننے کی کاوش کی جائے۔ ورنہ خطرہ ہے کہ کہیں ہم آخرت میں جانور سے بدتر سلوک کے مستحق نہ قرار پائیں۔

معاشرہ کے موجودہ فساد پر آپ جتنا بھی غور کریں گے، معلوم ہوگا کہ یہ سارا فساد حیوانی اور جبلی قوتوں کے غلبہ کی وجہ سے ہے، ہم نفسانیت اور نفسی قوتوں سے اوپر اٹھنے کے لئے تیار نہیں، دنیا پر ٹوٹ پڑنے کی نفسیات غالب سے غالب تر ہوتی جا رہی ہے۔ خوشحال لوگوں کی طرف سے غریب عزیز واقارب اور اڑوس پڑوس کے غریبوں کو ان کی حالت زار میں رہنے دینے کے مزاج، بات بات پر ایک دوسرے سے لڑتے رہنے اور انتقام لینے کی دوڑ، حکمرانوں، افسروں اور صنعت کاروں کی طرف سے اپنے لئے خوشحال زندگی کے جداگانہ جزیرے قائم کرنے کی روش اور ملک وقوم وملت کے بارے میں سارے مؤثر طبقات کے سنگلانہ رویے اور حکمرانوں کی طرف سے خزانوں کے ڈھیر جمع کرنے کی ہوس اور اپنے محلات اور وزرا اور افسروں کے شاہانہ اخراجات پورے کرنے کی خاطر پیٹرول اور بجلی کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ کے ذریعہ لوگوں کو مہنگائی کے عذاب میں مبتلا کرنے کی پالیسی وغیرہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو حیوانی جذبات اور نفسی قوتوں کے غلبہ کا نتیجہ ہیں۔

نفس پرست معاشرہ (جس میں نیکی اور خیر کو قبول کرنے کی استعداد نہیں ہوتی) وہ خدا کے عذاب ہی کا مستحق ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہماری حالت زار پر رحم فرما کر، ہمیں حیوانی جذبات ''وصفات'' سے بچا کر انسانی صفات سے بہرہ ور فرمائے۔ (آمین)

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

ڈاکٹر امجد صاحب

ڈاکٹر امجد صاحب متحرک نوجواں ہیں، جدید دور کے فکری رجحانات سے پوری طرح آشنا ہیں، سلوک میں ذوق وشوق سے چل رہے ہیں، دعوتی کام کا بھی جذبہ رکھتے ہیں۔ مستقبل میں ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

۵ مئی ۲۰۰۹ء

عزیزم ڈاکٹر امجد صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

آپ کا یہ کہنا کہ میں نے جدید دور کے بیشتر اسلامی مفکروں اور فاضلوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، مولانا مودودی، مولانا وحید الدین خان، مولانا ابو الحسن علی ندوی اور مولانا محمد حنیف ندوی وغیرہ سب کی بیشتر کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے علم میں تو اضافہ ہوا ہے اور دوسرے نوجوانوں کے سامنے اسلام کی علمی طور پر توجیہ پیش کرنے کے جذبہ میں بھی اضافہ ہوا ہے اور یہ کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے جدید افراد کا بھی ذہنی طور پر اسلام پر اطمینان پیدا ہو، لیکن ان کتابوں کے مطالعہ سے اتنی ایمانی قوت پیدا ہو کہ نماز کی پابندی ہوجائے، زندگی کا رخ بدل کر، اسلام سے ہمہ آہنگ ہوجائے، شریعت پر عمل کرنے میں آسانی پیدا ہوجائے۔ یہ چیز پیدا نہ ہوسکی ہے، جس کی وجہ سے میں پریشان ہوں کہ آخر عمل صالح کی قوت کیسے پیدا ہو، نماز کے لئے دل کی آمادگی کیسے ہو، اگر ممتاز دینی فاضلوں کی اسلامی کتابوں کے مطالعہ سے بھی دین کی عملی صورت پیدا نہیں ہوسکتی تو وہ کیا طریقہ ہے، جس سے میری عملی زندگی دین کے مطابق بنتی ہو۔

میں مطالعہ کا عادی ہوں اور دینی کتابوں سے ہی طبعی رغبت ہے، لیکن جوں جوں مطالعہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اسی حساب سے قیل قال کا غازی بنتا جاتا ہوں، اور فرائض کے بارے میں غفلت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ آپ سے ملاقات کرکے

بھی آپ کے سامنے میں نے زندگی کی اپنی سب سے بڑی الجھن پیش کی تھی۔ امید ہے کہ اس سلسلہ میں میری رہنمائی کریں گے۔''

دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے بارے میں آپ کی فکر مندی اور تشویش خوشی کی بات ہے، مطالعہ سے آپ کی رغبت بھی بڑی قابل قدر چیز ہے۔

آپ کو کتابوں کے بارے میں جو مغالطہ پیدا ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ کتابوں کا مطالعہ زندگی کے عملی رنگ ڈھنگ کو بدل کر بہتر مسلمان بنانے کا مؤثر ذریعہ ہے اور اصلاح نفس کا واحد طریقہ اسلامی کتابوں کا مطالعہ ہی ہے۔ دوسرے اہل علم کی طرح آپ کو بھی اس سلسلہ میں غلط فہمی لاحق ہے۔ عام طور پر کتابوں کا دائرہ کار معلومات میں اضافہ اور علم میں وسعت ہوتی ہے، کتابیں دین پر ذہنی طور پر اطمینان پیدا کرنے اور دین کی حمایت ووکالت کرنے کے معاملہ میں تو بہتر کردار ادا کرتی ہیں، لیکن عملی زندگی کا نقشہ بدل کر، نفس کی شہ زور قوت کو اللہ ورسول کے تابع بنانے کے سلسلہ میں کتابیں فیصلہ کن کردار ادا نہیں کرتی، بالخصوص نفسی حجابات کو دور کرنے اور باطنی بیماریوں سے بچا کر، فرد کو پاکیزہ کردار کا حامل بنانے کے سلسلہ میں تو کتابیں غیر مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔

اگر اصلاح نفس کے لئے محض کتابیں کافی ہوتی تو اہل کتاب یعنی یہودیوں کا کتابی علم کامل تھا، اور وہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا رسول سمجھتے تھے۔ اور قرآن کو اللہ کی کتاب ہی جانتے تھے، لیکن اس علم کے باوجود اہل کتاب کی اکثریت نے رسول اللہ ﷺ اور اسلام کو مٹانے میں اپنی قوتیں صرف کیں۔

قرآن کی آیت ہے۔

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْراً مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَاناً وَكُفْراً.

(آپ پر قرآن کی آیتوں کا جو نزول ہورہا ہے، اس سے اہل کتاب کی اکثریت کی سرکشی اور کفر میں اضافہ ہی ہوگا)۔

فرعون اور فرعونیوں کے بارے میں قرآن میں ہے **وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْماً وَعُلُوّاً** . (ان کے دلوں میں اس حق کے بارے میں یقین پیدا ہو چکا تھا، لیکن لیکن ظلم اور تکبر کی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔)

کتابوں کی ایک حد تک اہمیت سے انکار نہیں، لیکن کتابوں سے زندگی میں فیصلہ کن انقلاب برپا ہو اور کتابیں سیرت وکردار میں پاکیزگی پیدا کرکے، فرد کو دین اسلام کا عامل بنا دیں، یہ چیز عام طور پر کتابوں کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ بدقسمتی سے موجودہ دور میں مغربی فکر کے زیر اثر کتابی علم ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے، اس کے اثرات ہیں کہ مسلم دنیا میں بھی تہذیب نفس اور ضبط نفس کے لئے کتابی علم کو حرف آخر کی حیثیت دی گئی ہے۔ یہ اسلامی مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

افراد کی نفسی اصلاح کے لئے کتابی علم کے ناکافی ہونے کا اندازہ اللہ کی اس سنت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ نے کتابیں اور کل صحیفے تو ۱۰۴ نازل فرمائے، جب کہ انبیاء کرام سوا لاکھ مبعوث فرمائے۔

اللہ کی اس سنت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کی اصلاح بذریعہ انسان ہی ہوتی ہے۔ انسان کی تہذیب کا عمل بذریعہ انسان ہی سرانجام ہوتا ہے۔ نبوت کے خاتمہ کے بعد بھی اب تک امت میں اصلاح کے سلسلہ میں متقی اور ربانی علماء کی طرف ہی رجوع ہوتا رہا ہے، اس لئے کہ انسانی نفس کی اصلاح کا عمل اتنا پیچیدہ عمل ہے کہ مربی ومزکی شخصیت کی صحبت اور اس کی خصوصی نگرانی اور مسلسل توجہ سے ہی نفس کا تزکیہ ہو سکتا ہے، اس طرح نفسی قوتوں سے اسلامی شریعت ہضم کرانے اور نفس کو اسلام سے ہمہ آہنگ بنانے کا عمل سرانجام ہوتا ہے۔

اس نکتہ کی مزید تشریح کے لئے ہماری کتابوں ''معاشرہ کی تشکیل نو اور تصوف واحسان'' وغیرہ میں کافی تفصیل بحث موجود ہے۔ آپ یہ بحث ہماری کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۲۵ اپریل ۲۰۱۳ء

عزیزم ڈاکٹر امجد صاحب

السلام علیکم مزاج شریف

یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کا مراقبہ آدھے گھنٹہ تک پہنچ چکا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ پچھلے پانچ چھ سال سے ہمارے مراقبہ کے حلقہ میں پابندی اور مستقل مزاجی سے شریک ہورہے ہیں۔ پانچ چھ سال تک ہفتہ وار حلقہ میں شرکت سے تو اسم ذات کے ذکر سے آپ کی مناسبت کا تعلق پیدا ہونا چاہئے تھا۔ اور آپ کا یہ مراقبہ آدھے گھنٹے سے ایک گھنٹہ تک پہنچنا چاہئے تھا۔

اسم ذات کے ذکر ومراقبہ کے جتنے فوائد بھی بیاں کئے جائیں، وہ کم ہیں۔ یہ ذکر اللہ کے انوار حسن کو اخذ کرنے کا ذریعہ ہے، جو فرد، اللہ کے انوار حسن سے بہرہ یاب ہوجائے، اس کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے۔ اسم ذات کے ذکر سے دنیا کا رعب، اس کی دہشت اور خوف ختم ہوکر، محبوب حقیقی کی محبت غالب آجاتی ہے۔ اس ذات کا ذکر، فرد کو غیرمعمولی سکوں، سکینت اور خوشی ولذت سے فیضیاب کرتا ہے۔ اسم ذات کا ذکر فرد میں اسلام پر عمل پیرا ہونے کے بارے میں حساسیت میں اضافہ کرتا ہے۔ اسم ذات کے ذکر سے تخلقوا بااخلاق اللہ پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے فرد اسلام کے لئے سراپا درد اور تحرک بن جاتا ہے۔ اسم ذات کا ذکر فرد کے یقین کو مستحکم تر کردیتا ہے۔ مادیت اور کفر کی قوتوں اور ان کی تہذیب سے مرعوبیت کا خاتمہ کردیتا ہے۔

جو ذکر ومراقبہ دین ودنیا کی جملہ سعادتوں کا ذریعہ ہے اور جو مراقبہ زندگی کو گلزار بنا دیتا ہے، اس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہونا ضروری ہے۔ فرد، جس طرح جسمانی توانائی کے لئے کھانا کھاتا ہے، لیکن کھانے کا اثر پانچ چھ گھنٹوں میں ختم ہوجاتا ہے، فرد کو دوبارہ اور سہ بار کھانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اسی طرح ذکر ومراقبہ کا اثر بھی چند گھنٹوں کے بعد زائل ہوجاتا ہے، نئے سرے سے ذکر کی ضرورت پڑتی ہے، دن میں تین چار بار دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے مراقبہ اور ذکر سے فرد کو نئی ایمانی توانائی حاصل ہوتی رہے گی، جس سے فرد ہرقسم کے حالات میں ذہنی دباؤ سے بچا رہے گا اور مشکل سے مشکل حالات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا رہے گا۔

قرآن واحادیث ذکر کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں۔

موجودہ دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مادیت پرستی کی عالمی قوتوں نے

عالمی سطح سے لے کر ملکوں اور محلوں کی سطح تک ایسا ماحول پیدا کردیا ہے کہ ہر ذہین اور باصلاحیت فرد کا ہدف دنیا کی زندگی بن چکی ہے اور نئی نسل اپنی توانائیاں اسی مقصد کے حصول کے لئے صرف کررہی ہے، اس کے لئے تہذیب نفس اور دائمی زندگی کی فکر کی باتیں سب لایعنی ہوچکی ہیں۔

یہ دجالی تہذیب اور اس کے علمبرداروں کی کارستانی ہے کہ اس نے ساری انسانیت کو مادیت، مادی زندگی کی بہتری اور خوشحال زندگی کی فکر میں غلطاں کردیا ہے۔ ہماری نئی نسلوں کے وہ افراد، جو مولوی کے گھر میں پیدا ہوں یا صوفی کے گھر میں، ان میں سے اکثریت کی حالت بھی تقریبا یہی ہے۔ انسانیت کے ساتھ ہونے والا یہ المیہ ایسا ہے، جس پر خون کے آنسو ہی بہائے جاسکتے ہیں۔

آپ خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے آپ کو اپنی محبت کی دولت عطا فرمائی ہے۔ آپ کی معلومات کے لئے یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ دینی کتابوں کے مطالعہ نے بھی آپ کو غیرمعمولی فائدہ پہنچایا ہے، اس لئے کہ ان کتابوں کے مطالعہ سے آپ کی ذہنی وفکری اصلاح تو ہوچکی تھی، مادی تہذیب سے شعوری طور پر نفرت تو پیدا ہوچکی تھی، البتہ عمل کی قوت آپ کے اندر اللہ کی محبت ومعرفت کی دنیا میں شامل ہونے کے بعد پیدا ہونا شروع ہوئی، اس لئے اسلامی فاضلوں کی کتابوں کے مطالعہ کی عادت بھی ضروری ہے، تاکہ جدید نسلوں کو علمی طور پر اسلام پر مطمئن کرنے کے لئے ان کے دلائل سے استفادہ کی صورت پیدا ہوسکے۔

ہماری سندھ کی نسلیں مادیت اور سیکولرزم کی فکر سے بُری طرح متاثر ہیں، ان میں کام کرنے کے لئے جدید نوعیت کے لٹریچر کو پھیلانے کی ضرورت ہے، الحمدللہ آپ ایک حد تک یہ کام بھی سرانجام دے رہے ہیں۔

امید ہے کہ اس مختصر خط کو کافی سمجھیں گے اور دنیا کی مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہوکر، دائمی زندگی کے مستقبل کی بہتری کو اپنے فکر کا مرکزی نکتہ بنائیں گے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

عبدالکریم گاندھی صاحب

عبدالکریم صاحب، راہ سلوک کے مخلص اور مضطرب طالب ہیں۔ وہ دینی خدمت کے کاموں سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں ''بیداری'' کے مشن کو اپنا مشن سمجھتے ہیں۔ وہ ذہنی وعملی اعتبار سے بہتر صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ ان کے دوستوں کا وسیع حلقہ ہے، جو سب ان سے محبت کرتے ہیں۔ موصوف اس عاجز کے ساتھ محبت کا تعلق رکھتے ہیں اور مستقل رابطہ میں رہتے ہیں۔

ان پر اپنی اصلاح کی فکر بہت زیادہ غالب ہے، اس لئے وہ اکثر خطوط کے ذریعہ نفس کے مدوجزر سے نکلنے اور روحانیت میں آگے بڑھنے کی تدابیر ومشورے دریافت کرتے رہتے ہیں۔

۲۷ جنوری ۲۰۱۱ء

برادر عزیز عبدالکریم گاندھی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جو اس دور میں تصور کے مجدد ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ تصوف میں بیعت ضروری نہیں ہے، صحبت ضروری ہے۔ اصل فیض صحبت سے منتقل ہوتا ہے۔ ایک صاحب تھے، جو مولانا کی صحبت میں آیا کرتے تھے، آخر میں مولانا نے اسے خلافت بھی عطا کی۔ ان صاحب نے عرض کیا کہ میں تو اب تک آپ سے بیعت بھی نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا سلوک طے ہوگیا ہے۔ اب بزرگوں کی روایت پوری کرنے کی خاطر بیعت بھی کرتا ہوں اور ساتھ ساتھ خلافت بھی۔

بزرگوں کے ہاں ایسا ہوتا رہا ہے، مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ صاحبان ، بیعت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تھے، لیکن ان کی ساری تربیت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ حضرت قبلہ مرشدی ڈاکٹر صاحبؒ سے بیعت ہونے والے افراد بے شمار تھے، دوچار لاکھ سے زیادہ، لیکن صحبت میں آنے والے افراد دوچار

ہزار سے زیادہ نہیں تھے۔ نتیجۃً بیعت ہونے والے ۹۵ پرسنٹ افراد اصلاح کے ابتدائی مراحل سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اگر کسی صاحب دل شخصیت کی صحبت اور ان سے رابطہ سے ذکر اور مراقبہ کے لئے آمادگی اور ذوق شوق کی فضا پیدا ہورہی ہے اور اصلاح کی بتدریج صورت پیدا ہورہی ہے تو یہی تو تصوف ہے۔

تصوف نہ تو خواب، القا، کرامات کا نام ہے، نہ ہی بیعت کا (اگرچہ بیعت ہونا ایک اعتبار سے ضروری بھی ہے) وہ صحبت اور رابطہ کا نام ہے۔ اگر صحبت اور رابطہ سے تعلق مع اللہ کے استحکام کی صورت پیدا ہورہی ہے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہئے، اور اس تعلق کی قدر کرنی چاہئے، جس مٹکہ میں دوچار قطرے پانی ہو، اس مٹکہ سے گلاسوں کے گلاس پانی نکل سکے، ممکن ہی نہیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ خلافت ملنے کے باوجود کسی نہ کسی بزرگ کی سرپرستی ضروری ہے۔ سرپرستی کی وجہ سے آدمی نفس کو یہ بتاتا رہتا ہے کہ تم آزاد نہیں ہو، تمہاری باگ فلاں شخص کے حوالے ہے۔ یہ نفس کو نفسیاتی طور پر انتباہ دینا ہے، تاکہ وہ اپنے آپ کو بزرگ سمجھکر سرکشی اختیار نہ کرے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے خلافت حاصل تھی، ان کے وصال کے بعد انہوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو اپنا بڑا بنایا تھا اور ان کی سرپرستی اختیار کرلی تھی۔

اپنی اصلاح کے نقطہ خیال سے یہ چند سطریں لکھیں ہیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کی اور میری اصلاح فرمائے۔ (آمین)

والسلام
احقر
محمد موسیٰ بھٹو

۲۰ مارچ ۲۰۱۲ء

عزیزم عبدالکریم گاندھی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

آپ کا خط ملا، حالات معلوم ہوئے۔ انسانی نفس کی سب سے بڑی کارستانی یہ ہے کہ وہ مادی حسن سے آخری حد تک متمتع اور مستفیض ہونا چاہتا ہے اور پھر بھی تسکین

نہیں ہوتی۔ مادی حسن سے محبت ماند اور کمزور پڑ جائے، اس کی سب سے بہتر صورت اللہ کی محبت میں شامل ہوکر، کثرت سے ذکر ومراقبہ کرنا ہے۔ ذکر ومراقبہ سے قلب پر اللہ کے انوار اس قدر جاگزین ہوتے ہیں کہ مادی حسن اور مخالف جنس میں کشش باقی نہیں رہتی، حدیث شریف میں آتا ہے کہ نوعمر حسین لڑکے کی مثال حور کی سی ہے۔ حور تو اپنے اندر کشش رکھتی ہے۔ حسین چہروں کو دیکھنے اور ان کی صحبت سے بچنا بھی بہت ضروری ہے۔

اللہ نے یہ زندگی شدید ترین آزمائش کے لئے عنایت فرمائی ہے۔ نفس کی خواہشوں کا ایک تلاطم ہے، جو اندر سے اٹھتا رہتا ہے۔ اگر خواہشوں کا یہ طوفان نہ ہوتا تو انسان کی تخلیق کی ضرورت نہیں تھی، عبادت کے لئے فرشتے ہی کافی تھے۔ آزمائش یہ ہے کہ نفس کی قوت کو اللہ ورسول کے تابع کیا جائے، اس کے بدلہ میں دائمی اور ابدی زندگی کا سکون وسرور ولذت کا سامان مہیا ہوگا۔ اس مقصد میں ناکامی کے بعد دائمی زندگی میں اضطراب کے انگاڑے ہوں گے، فرد اگر اس دنیا میں حاصل لذتوں کے بارے میں غور وفکر سے کام لے تو محسوس ہوگا کہ ساری لذتوں کی حیثیت چندلمحوں کے احساساتِ لذت سے زیادہ کچھ نہیں۔ پیچھے مڑکر، زندگی بھر حاصل ہونے والی لذتوں کو دیکھاجائے تو وہ لذتیں یادہی نہ ہوں گی۔ بلکہ پچھلے دوچار دنوں میں حاصل ہونے والی لذتوں ہی کو فرد بھول جاتا ہے، ایسی لذتیں جو اتنی ناپائدار ہیں، ان کی خاطر ابدی زندگی کی لذتوں سے محروم ہونا، سخت نقصان کا سودا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ مخالف جنس کو جاتے ہوئے دیکھکر نظر نیچے کر لیا کرو تو تمہیں غیرمعمولی حلاوت عطا کی جائے گی (ایسی حلاوت جس کے مقابلہ میں مادی حسن کی حلاوت ہیچ ہے)۔

نفس کو مطیع کرنے اور خواہشات پر کنٹرول کرنے اور نفس امارہ کو نفس مطمئنہ بنانے کا شارٹ کٹ نہیں۔ اس دنیا میں مجاہدوں کے لئے ہی بھیجے گئے ہیں۔ ذکر وفکر کے مجاہدوں کے بغیر کسی کے لئے بھی چارہ کار نہیں۔

موجودہ دنیا اتنی مصروفیت کی دنیا ہوگئی ہے کہ اب لوگوں کے پاس وقت نہیں رہا، ورنہ ہماری روایت یہ رہی ہے کہ صدیوں سے اصلاح نفس کے متمنی افراد، برسوں

تک بزرگوں کی خانقاہ میں آکر ٹھیرا کرتے تھے، بڑے بڑے بزرگوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اصلاح نفس کے ابتدائی ودرمیانی مراحل طے کرنے کے لئے اپنی زندگی کی ضروریات بہت محدود کرلی تھیں۔ دوسرے کاموں سے یکسو ہوکر، راہ سلوک میں جت گئے تھے، اس کے بعد اللہ نے انہیں وہ مقام عطا کیا۔

آج کے دور میں فرد کے لئے عملا وقت نکالنا مشکل ہے۔ موجودہ حالات کی مناسبت سے اللہ کی طرف سے ضرور رعایت حاصل ہوگی۔ یعنی یقین واخلاص اور معرفت اور سیرت وکردار کے بہت بلند مقامات نہ سہی، ٹوٹے پھوٹے مقامات بھی قبول کر لئے جائیں گے۔ اس طرح کی ایک حدیث شریف بھی آتی ہے۔

آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو اللہ نے دردعشق سے نوازا ہے اور راہ سلوک میں چلنے کی طلب اور تڑپ عطا فرمائی ہے۔ اور گناہوں سے نفرت کا جذبہ عطا کیا ہے، لاکھوں لوگوں میں یہ سعادت چند افراد ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اب مزید ہمت کی ضرورت ہے کہ جب بھی گناہ کا موقعہ میسر ہو، اس وقت جبر کرکے، وہاں سے چلے جایا کریں اور ایسی صحبت سے جبرا بھاگ جانا چاہئے۔ گناہ سے بچنے کے لئے ہمت اور ساری توانائیوں کے استعمال کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

راہ سلوک میں معالج بدلنا کافی نقصان دہ ہوتا ہے، اس کی وجہ سے دل کسی بھی ایک معالج پر نہیں ٹکتا۔ نتیجۃ جم کر کسی ایک بھی معالج سے علاج نہیں ہوتا۔

ہر صوفی (آپ بھی صوفی ہیں راہ سلوک میں چلنے والے ہر فرد کو صوفی کہا جا سکتا ہے) کو راہ میں چلتے ہوئے نفس کے ہزارہا تجربات ہوتے ہیں۔ وہ نفس کی وسیع تر دنیا کا تجربہ ومشاہدہ کرکے آتے ہیں۔ نفس انہیں حب جاہ وحب مال، حرص وہوس دعویٰ اور مادی حسن پر فریفتگی پر لگانا چاہتا ہے اور اس راہ پر اکسانا چاہتا ہے، وہ برسوں تک اس کشمکش میں رہتے ہیں، لیکن نفس کے ہر حملے کے موقعہ پر ذکر کا نور انہیں اوپر اٹھاتا ہے۔ راہ سلوک کے طالب کو سب سے بڑا اور تلخ تجربہ جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ گناہ اور قبض کے ہر موقعہ اور موڑ پر وہ سخت مضطرب ہوجاتا ہے، اس کی بے چینی انگاروں پر لیٹنے کے مترادف ہوتی ہے۔ شیطان اس طرح کے مواقع پر اسے یہ بات سجھانے کی

کوشش کرتا ہے کہ اللہ کی محبت کی راہ دشوار تر ہے، اس راہ کو طے کرنا اور نفس مطمئنہ تک پہنچنا، تمہارے لئے ممکن نہیں، یہ لمبا سفر ہے، جو تم سے طے نہیں ہو سکتا۔ شیطان کی پیدا کردہ یہ مایوسی طالب کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہوتی ہے، جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

گناہوں، سے بچنا اور اس کی کوشش کرنا ہمارا کام ہے، اگر کوشش کے باوجود گناہ ہوجائے تو توبہ کرکے آگے چلتے رہنا چاہئے۔ ایک ہونے والے گناہ کو پالتے رہنا اور اسے بہت بڑی چیز سمجھنا، یہ شیطانی حربہ ہے، جو فرد کو اللہ سے مایوس کرنا چاہتا ہے اور اللہ کی راہ سے دور کرنا چاہتا ہے، اللہ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ ریت کے پہاڑ کے ذروں جتنے گناہ بھی ہوں تو بندہ کے وہ گناہ بھی سچی توبہ سے معاف ہوجاتے ہیں۔ اس طرح کی ایک حدیث موجود ہے۔

جس اللہ نے جس فرد کے لئے اپنی محبت کی راہ کھولی ہے، وہ عطا فرمانا چاہتا ہے، تب ہی تو اس نے یہ راہ نصیب فرمائی ہے۔ یہ اہم نکتہ ہے جسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس سے قبض وبے چینی کے ہر موقعہ پر ازسرنو اٹھکر چلنے اور حوصلہ پیدا ہونے کی صلاحیت ابھرے گی۔

والسلام
احقر
محمد موسیٰ بھٹو

۱۰ جولائی ۲۰۱۲ء
عزیزم عبدالکریم گاندھی صاحب
السلام علیکم : مزاج شریف
آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آج ہی جواب ارسال کررہا ہوں۔
اللہ کی محبت کی راہ آتش عشق میں جلتے رہے، اپنے اعمال کو اللہ کی بارگاہ میں

حقیر سمجھنے، اپنے دینی کاموں کو عنداللہ قبولیت نہ ہونے کے خطرہ سے ڈرتے رہنے، اپنی نماز روزہ اور عبادات کو رسمی خانہ پُری سمجھنے، اپنے آپ کو سراپا سیاہ کار سمجھنے کی راہ ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ میں اپنے آپ کو ایک فرنگی سے بھی کم تر سمجھتا ہوں، اس لئے کہ اگر میں اپنے آپ کو اس سے افضل سمجھنے لگوں تو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ایمان کی دولت سلب کرکے، اسے عطا کردے، اسی طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ میں اپنے آپ کو ایک چمار سے بھی حقیر سمجھتا ہوں، نیز مجھے اگر جنتیوں کے قدموں میں جگہ مل جائے تو یہ میرے لئے سب سے بڑی سعادت ہوگی۔

حدیث شریف ہے کہ بعض صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ، ہمارے دلوں میں ایسے ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں کہ اس سے بہتر سمجھتے ہیں کہ آگ میں جل کر راکھ ہوجائیں، آپ نے ان کے اس احساس کو ایمان کی علامت قرار دیا، ایک حدیث شریف میں ہے کہ ستر (۷۰) بدری صحابی اپنے آپ کو (اپنے اعمال کو) منافقت سے مشابہت دیتے تھے، یعنی انہیں اپنے اخلاص کے بارے میں شک رہتا تھا۔

آپ کے خط آنے سے پہلے میں حضرت امداد اللہ مہاجر مکی کی سوانح پڑھا رہا تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سینکڑوں اکابر علماء کے مرشد تھے۔ برصغیر ہند میں بزرگوں میں انہیں ممتاز مقام حاصل تھا۔

ان کے کچھ اشعار ہیں:

بیان حال اب اپنا کرتا ہوں میں کہ جس فکر میں روز مرتا ہوں میں
مجھے آگیا جو خیال ایک رات لگا سوچنے اپنے دل میں یہ بات
کہ افسوس غفلت میں جاتی ہے عمر سدا کوس رحلت بجاتی ہے عمر
مجھے فکر کل کی ہوئی آج یوں کہ کی دولت عمر برباد کیوں کی
نہ سوں شب اس فکر میں ایک دم رہا رات بھر اس سے میں چشم نم
اسی میں گئی رات ساری گزر شش وپنج کرتا رہا تا سحر
کہا نفس کو آخرش (آخر) میں نے رات کہ کیا ہوگیا تجھ کو اے بد صفات
خبرحال کی تجھکو اپنے نہیں کہ آیا تھا یا (یہاں) کس لئے اے لعین

بتا تجھ سے کیا حق کو منظور تھا یہاں آکے کیا کام تو نے کیا

آپ کی یہ حالت بھی اس بات کی علامت ہے کہ آپ سلوک میں توسط کی حالت میں ہیں۔ متوسط صوفی نیم مدہوشی کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کا دل دنیا کے سارے کاموں سے اچاٹ رہنے لگتا ہے، وہ جبرا زندگی کے کام سرانجام دیتا ہے، اس کا دل تو یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا کو ترک کردے اور بس اپنی حالت زار پر روتا رہے۔ اور زندگی کے ضیاع اور کچھ بھی نہ ہونے اور کچھ بھی نہ کرنے اور زندگی کے قیمتی اوقات ضایع ہونے کے غم میں گھلتا رہے۔

سالک کی یہ عجیب وغریب زندگی ہے، کہ شب وروز انہی احساسات میں رہنے لگتا ہے۔

محبوب حقیقی چاہتا ہے کہ طویل عرصہ تک ان احساسات میں رکھکر، سالک کو اپنی بارگاہ میں قدرومنزلت والا بنایا جائے، نیز اس سے مقصود یہ بھی ہوتا ہے کہ سالک کو نفس کی انانیت اور اس کے حجابات سے بڑی حد تک بلند کیا جائے۔

جس شخص پر عرصہ تک محبوب کے جلال کے تیروں کی بارش ہوتی ہو اور جو اپنے اعمال کو نفاق، ریا اور رسمیت سے سرشار سمجھتا ہو، اسے جب ہوش عطا کیا جائے یعنی حالت سُکر سے حالت صحو میں لایا جائے گا تو ان شاء اللہ وہ بزرگی اور اپنے نیکوکار ہونے کے دعویٰ اور دوسروں کی تحقیر کی بیماری سے محفوظ رہے گا۔

راہ سلوک کا مقصد سالک کو نفس کی مکر وفریب کی واردات کا مشاہدہ کرانا بھی ہے، اس مشاہدہ کے بعد سالک، زندگی بھر نفس سے چوکنا رہتا ہے اور نفس کی واردات اور اس کے حملوں کے بارے میں وہ زیادہ حساس ہوتا ہے۔

ان حالات میں صبر وشکر کا مظاہرہ کرنا کہ محبوب جس حالت میں رکھے، وہ قبول ہے۔ محبوب حقیقی کو بندہ کی یہ ادا بہت پسند ہے۔ ایک بزرگ نے کتنا اچھا لکھا ہے کہ لوگوں کو کیا معلوم کہ اللہ کی محبت کا راہی کن حالات میں رہتا ہے۔ وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ہنستا بھی ہے اور کھاتا بھی ہے، حالانکہ اس پر ہر وقت تیر گرتے رہتے ہیں۔

آپ خوش نصیب ہیں کہ صبر کے ساتھ محبوب کی ان اداؤں کو برداشت کررہے

ہیں۔ حوصلہ وہمت کی ضرورت ہے۔ اللہ کے طالب بیس بیس سال ان حالات میں رہتے ہیں، تب کہیں جاکر شرح صدر کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں راقم نے اپنی کتابوں میں کافی تفصیل سے لکھا ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۲۷مارچ ۲۰۱۲ء

عزیزم عبدالکریم گاندھی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

اللہ کی محبت کی دنیا میں آنے کے بعد شیطان کا ایک بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ طالب کو اپنے گناہ یاد دلاکر، ان گناہوں کے بہت بڑے ہونے اور قبول نہ ہونے کا تصور مستحکم کرکے، اسے اللہ کے راستے پر آگے بڑھنے سے روکا جائے اور اپنے گناہگار ہونے کے احساس کو بار بار یاد دلاکر، اسے الجھایا جائے۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ سچی توبہ کرنے سے بڑے سے بڑے گناہ بھی معاف ہوجاتے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اے میرے بندہ، اگر تمہارے گناہ زمین سے آسمان تک پھیلے ہوئے ہوں تو وہ سارے گناہ میں معاف کروں گا۔

گناہ کے بعد قلب میں جو حجاب ڈال دیئے جاتے ہیں، یہ حجابات اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ طالب کو سزا دے دی گئی ہے۔ گناہ پر آہ زاری کرنے اور آہ زاری کے بعد بسط وخوشی کی جو کیفیت بحال کردی جاتی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ معافی دے دی گئی ہے۔

اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے شیطان، طالب کو بار بار اپنا گناہ یاد لاکر، اس کی راہ کھوٹی کرنا چاہتا ہے اور ذکر، عبادت اور اللہ کی محبت کی راہ میں دیوار کھڑی کرنا چاہتا

ہے۔

وَسِعۡتَ كُلَّ شَیۡءٍ رَّحۡمَةً : ''اللہ کی رحمت ہرچیز پر وسیع ہے'' ایک حدیث شریف میں ہے کہ بندہ کے ریت کے پہاڑ جتنے بھی گناہ ہوں تو اللہ توبہ سے وہ سب معاف کردیتا ہے۔

توبہ کرکے آدمی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے کی بجائے آگے چلتا جائے۔ گناہ کے بعد اگر ذکر کی توفیق ملتی ہے اور نیک افراد کی مجلس کی طلب کی خواہش بڑھتی ہے تو یہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ قبولیت کا شرف حاصل ہے، اگر عتاب ہوتا تو یہ ساری چیزیں سلب کردی جاتی اور طلب ختم کردی جاتی۔ جس طرح عام طور پر گناہگاروں کی حالت ہوتی ہے۔

آپ خوش نصیب ہیں کہ اللہ کی محبت کی راہ میں آپ کی طلب رکی نہیں ہے، بلکہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحی عارفی ؒ نے فرمایا تھا کہ اللہ کی رحمت کے مقابلہ میں اپنے گناہوں کو بڑا نہ سمجھا جائے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کراچی کے ایک کروڑ افراد کے گند کچرے کو صبح کے وقت سمندر سے اٹھنے والی ایک لہر اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ کہاں سمندر کی ایک لہر اور کہاں کروڑ افراد کی غلاظتیں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۶ جولائی ۲۰۱۲ء

عزیزم عبدالکریم گاندھی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

آپ کا عنایت نامہ ملا۔

باتوں کا بھول جانا جسے نسیان کہتے ہیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ

سلوک میں درمیانی حالت میں ہیں۔ ہر سالک کو ان حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔ جب دل ودماغ سے دوسری چیزوں کا نسیان ایک عرصہ تک ہونے لگتا ہے تو اس کے بعد حافظہ کو تیز تر کردیا جاتا ہے اور ساری اہم باتیں نئے حکمت کے علوم کے ساتھ عطا کردی جاتی ہیں۔ اس لئے حافظہ کے نسیان سے پریشان ہونے کی ضرورت ہرگز نہیں، یہ سلوک ہی کا حصہ ہے اور سلوک میں چلتے رہنے کی علامت بھی۔

آپ نسان سے پریشان نہ ہوں، اللہ تعالیٰ انہی حالات میں ایسے راستے نکالتا ہے کہ سالک کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔ محبوب، اپنی محبت کے رنگ کو غالب کرنے کے لئے دوسری باتیں بھلا دیتا ہے، یہ فنائیت کی علامت ہے جو سعادت سے کم نہیں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۱۱ اکتوبر ۲۰۱۲ء

عزیزم عبدالکریم گاندھی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

آپ کا خط ملا، آپ کا اصلاح کا شوق وجذبہ قابل قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں

مزید اضافہ فرمائے۔ (آمین)

روحانی دنیا میں نفس مطمئنہ کے حصول کے لئے داخل ہونے کے بعد اس کے بعض بنیادی اصول ہیں، جو بزرگوں نے اپنی کتابوں میں بیان کئے ہیں۔ ان اصولوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک بڑا اصول یہ ہے کہ جب تک سلوک قابل ذکر حد تک طے نہ ہو، تب تک اپنے مربی کے علاوہ دوسرے بزرگوں سے تعلقات قائم نہ کئے جائیں، اس لئے کہ مختلف بزرگ، مختلف قسم کی تاثیری صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ مبتدی ومتوسط ان کی تاثیری صلاحیتوں سے متاثر ہوکر، اپنے مربی سے منقطع ہوکر، کچھ مہینوں کے لئے تو ان سے وابستہ رہے گا، لیکن جلد ہی اس کا دل بھرجائے گا اور اس بزرگ سے وابستگی اس کی متاثر ہوگی۔ پہلے مربی کے دل کو مکدر کرنے اور اس نئے بزرگ سے ہنگامی اور جذباتی تاثر کے ختم ہونے کے بعد وہ دوراہے پر کھڑا ہوگا۔ پھر نئے بزرگ کی تلاش میں وقت صرف کرے گا، اس لئے وہ جم کر کسی بھی ایک مربی سے فیض حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوجائے گا۔

جس طرح جسمانی بیمار بیک وقت دوتین ڈاکٹروں کی دوائی استعمال نہیں کرسکتا، کرے گا تو دواؤں کے اثرات ٹکرائیں گے اور وہ مزید بیمار ہوجائے گا، اسی طرح روحانی دنیا کا طالب بھی اگر بیک وقت کئی مربیوں کی صحبت اختیار کرے گا تو ایک تو وہ کسی بھی ایک مربی کے رنگ کو قبول نہ کرسکے گا، وہ جس انداز سے اس کی تربیت کرے گا، وہ تربیت نہ ہو سکے گی۔ دوم یہ کہ ہر مربی کی صحبت اسے اپنے پہلے والے مربی سے دور کردے گی، اس کا آخری نتیجہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طالب نئے نئے مربیوں کی تلاش میں عمر صرف کردیتا ہے۔ ابتدائی مربی سے دوری کی یہ سزا ملتی ہے کہ اسے کسی بھی مربی سے جم کر فیض حاصل کرنے کی استعداد وصلاحیت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

بزرگوں کی تصریح یہ ہے کہ اصل مرشد وہی ہوتا ہے، جس کی صحبت اختیار کی جائے۔ اس لئے کوئی بھی مربی اپنے مبتدی ومتوسط طالب کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوسرے بزرگوں یا بزرگ کی صحبت میں جاتا رہے، اس لئے کہ اس اجازت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ وقتی اور ہنگامی جذبات وکیفیات سے مغلوب ہوکر، آگے چل

کر دومربیوں کے اثرات کے درمیاں فکری انتشار کا شکار ہوجائے۔ کچھ دنوں کے بعد جب نئے بزرگ کی صحبت کی وقتی کیفیات ختم جائیں گی تو اب دوبارہ پرانے بزرگ سے وابستہ ہونے کی کوشش کرے گا، جب کہ اس بزرگ کا دل بھی مکدر ہوچکا ہوگا۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی ملفوظات میں ایک بزرگ کے خلافت یافتہ شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ دور دراز کا سفر کرکے، ایک یوگی کی ملاقات کے لئے پہنچے، وہ یوگی روحانی طور پر غیرمعمولی طاقتور تھا، اس نے جب اس بزرگ پر نگاہ ڈالی تو اس کی تصویر اس بزرگ کے ذہن میں سما گئی، اس حد تک کہ نماز پڑھتے، ذکرکرتے اور سوتے وغیرہ ہر وقت اس کی تصویر سامنے آتی۔ سخت پریشان ہوا، لیکن تصویر نہ نکلی۔ کوئی دو چار ہفتوں تک یہ صورت رہی۔ بالآخر وہ اپنے بزرگ کی خدمت میں پہنچا، بزرگ کو ساری صورتحال بتائی۔ اس بزرگ نے خلیفہ سے کہا کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ ایسے سخت ریاضتوں والے یوگی کی صحبت میں جاؤ۔ اب بھگتو، خیر اس بزرگ نے توجہ سے اس سے وہ تصویر نکالی۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۱۵ دسمبر۲۰۱۲ء

عزیزم عبدالکریم صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

اس نکتہ کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ راہ سلوک میں طالب (وہ چاہے مبتدی ہو یا متوسط) اس کا مزاج تاثیر پذیر ہوتا ہے یعنی اس کی خاصیت یہ ہوتی ہے

کہ وہ متاثر ہوتا رہتا ہے۔ سلوک طے کرنے والے ہر بزرگ کو دیکھکر، اس کا دل مچلنے لگتا ہے اور وہ اس کی طرف کھنچنے لگتا ہے۔ جس طرح ہر نیا کپڑا خوبصورت ہوتا ہے اور دوسروں کی کشش کا موجب ہوتا ہے، یا جس طرح مٹی کا نیا لوٹا، جس میں پانی ڈالتے ہی وہ سوں سوں کرنے لگتا ہے اور اس میں جوش خروش ہونے لگتا ہے، یہی حالت راہ سلوک میں چلنے والے طالب کی اس وقت ہوتی ہے، جب وہ کسی فنا فی اللہ بزرگ کو دیکھتا ہے، لیکن چند دنوں کے بعد کسی دوسرے فنا فی اللہ بزرگ کو دیکھتا ہے تو پھر اس کا دل مچلنے لگتا ہے۔

مبتدی ومتوسط طالب کے اس تاثیر پذیرانہ مزاج اور اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے تصوف میں یہ اصول ہے کہ سلوک طے کرنے سے پہلے طالب متعدد بزرگوں سے ملنے اور ان کی صحبت اختیار کرنے کی روش اختیار نہ کرے۔ جس طرح پرائمری اسکول میں پڑھنے والا طالب، بیک وقت دوسکولوں میں داخل نہیں ہوسکتا۔ داخل ہونے کی کوشش کرے گا تو کسی بھی ایک سکول سے تحصیل نہ کرسکے گا۔ اسی طرح روحانیت اور روحانی دنیا میں اپنے مربی کے علاوہ دوسروں سے روحانی تعلق قائم کرنا، یا ان کی صحبت اختیار کرتے رہنا، اس سے طالب وقتی طور پر تو فائدہ محسوس کرے گا، لیکن اس کا طبعی رجحان اور اس کی طبعی مناسبت کسی بھی ایک مربی سے پیدا نہ ہو سکے گی اور اس کی توجہ کا رخ بدلتا رہے گا، توجہ کے اس رخ کے بدلتے رہنے سے وہ دوراہے پر کھڑا ہوجائے گا اور طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود کسی ایک بھی بزرگ کے فیوض وبرکات کو نہ سمیٹ سکے گا، اور کسی طرف سے بھی اس کی پوری طرح تربیت نہ ہو سکے گی۔ شیطان چاہتا ہے کہ طالب کی توجہ تقسیم ہوتی رہے تاکہ وہ راہ سلوک میں بظاہر چلتے رہنے کے باوجود عملا ایک جگہ منجمد ہوجائے۔

یہ عاجز اس سے زیادہ کیا عرض کرے۔

اسی کو کافی خیال فرمائیں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۱۲جنوری۲۰۱۳ء

برادر عزیز عبدالکریم گاندھی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

آپ کا عنایت نامہ ملا۔

روزانہ کی بنیادوں پر صحبت کے سلسلہ میں ایک صورت یہ ہے کہ اس عاجز سے موبائل پر تفصیل سے حال واحوال ہوجائے۔ یہ رابطہ بھی صحبت کے زمرے میں ہی آتا ہے۔ اگرچہ براہ راست صحبت سے کم اثرات کا حامل ہے، لیکن اس کے اثرات ضرور ہوتے ہیں۔

وسوسوں کے سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ انسانی نفس اور ذہن کی ساخت اللہ تعالیٰ نے اس طرح رکھی ہے کہ اس میں دنیا جہاں کے خیالات آتے رہیں گے اور ہر طرح کے وسوسات پیدا ہوتے رہیں گے۔ جس طرح شاہراہ پر گدھا گاڑی بھی چلتی ہے تو اونٹ گاڑی بھی۔ بادشاہ کی سواری بھی چلتی ہے تو مزدور کی سائیکل بھی چلتی ہے۔ مالدار کی کار بھی شاہراہ پر چلتی ہے تو کلرک کی موٹرسائیکل بھی۔ شاہراہ پر کسی کو بھی چلنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ البتہ جب بادشاہ کی سواری آتی ہے تو ساری ٹریفک کو روک دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب تک فرد نفس مطمئنہ اور فنائے نفس کے آخری مقام تک نہیں پہنچتا، تب تک وسوسے اور خیالات گھیرے رہتے ہیں۔ **فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا.** ہم نے انسان کے اندر بُرائی کی سرشت بھی رکھی ہے تو اور نیکی کی بھی دونوں رکھ دی ہیں۔

اللہ کی محبت کی راہ میں بُرائی اور تقویٰ اور رحمانی اور شیطانی قوتوں کے درمیاں شدید جنگ شروع ہوجاتی ہے۔ بالخصوص متوسط طالب یعنی درمیانی سطح کے طالب کی،

نفس اور شیطان کے خلاف جنگ انتہائی تیز سے تیزتر ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات طالب تھک جاتا ہے اور شل ہوجاتا ہے۔ لیکن چونکہ نفسی قوتوں کو شکست دیکر، انہیں مکمل طور پر اللہ ورسول کی اطاعت میں دیئے بغیر نہ تو عبدیت (بندگی) کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور نہ ہی آخرت کی دائمی زندگی میں نجات کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، اس لئے اس راستے سے گزرے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

شیطان نے چیلنج دیا تھا۔

قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَآئِلِهِمْ وَلاَ تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ. (الاعراف آیت ۱۶۔۱۷) (وہ کہنے لگا کہ چونکہ آپ نے مجھے گمراہ کیا ہے، اس لئے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کے لئے (انسان کے لئے) آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان پر حملہ کروں گا۔ ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی اور ان کے داہنی جانب سے بھی اور ان کے بائیں طرف سے بھی اور آپ ان میں سے اکثر کو احسان ماننے والا نہ پائیں گے)۔

بہت سارے وسوے شیطان کی طرف سے آتے ہیں۔ شیطان کا کام ہی وسوے ڈالنا ہے۔ لیکن ان وسوسوں سے پریشان ہونے کی بجائے صبر وہمت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ راہ محبت میں قبض اور وسوسوں کی ایک صورت وہ ہوتی ہے، جس کا مقصود طالب کو اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرنے اور اللہ سے محض اس کا فضل مانگتے رہنے کی نفسیات کو پختہ کرنا ہوتا ہے۔

آپ کو رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تعلق ہے۔ یہ تعلق آہستہ آہستہ مزید بڑھتا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جو وسوسے آتے ہیں، وہ شیطان کے وقتی طور پر پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ تاکہ طالب کو مایوس کرکے، محبت کی راہ سے دور کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے آپ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ آپ کے سامنے اگر کوئی شخص حضور کی شان میں گستاخی کرے تو آپ غصہ سے بے قابو ہوجائیں گے۔ یہ علامت ہے اس

بات کی کہ آپ ﷺ سے آپ کو محبت کا تعلق قائم ہے۔

اگر وقتی طور پر شیطان کی طرف سے وسوسے آئیں تو ان کا علاج یہ ہے کہ انہیں اہمیت نہ دی جائے۔ جب اہمیت نہ دیں گے تو شیطان مایوس ہوجائے گا اور وہ وسوسے ڈالنا میں محتاط ہوجائے گا۔

افرادِ معاشرہ میں یا دوستوں کے حلقہ میں عزت حاصل ہو اور دوستوں کی طرف سے بہتر معاملہ ہو اور عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچے، یہ جذبہ ایک حد تک فطری نوعیت کا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے حقیر نہ سمجھا جائے اور کم حیثیت نہ دی جائے، اس کے ساتھ محبت سے اور اخلاص سے دل کی گہرائیوں سے پیش آیا جائے۔ البتہ معاملہ اس وقت خراب ہوتا ہے، جب فرد اس فطری جذبہ سے آگے بڑھکر، اپنے آپ کو دوسروں سے افضل مقام کا حامل سمجھنے لگتا ہے۔ یا دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔

فرد، راہ محبت میں جوں جوں آگے بڑھتا جائے گا، اس میں فنائیت کے آثار اور علامتیں آتی جائیں گی۔ یعنی افراد معاشرہ اور دوست واحباب اسے حیثیت دیں یا نہ دیں، اس کی صحت اور نفسیات پر اس کا کوئی خاص اثر نہ پڑے گا، وہ اپنی ذات کو مٹا ہوا محسوس کرے گا۔ اور یہ فطری خواہش کہ اسے کچھ حیثیت دی جائے (جو ہر اعتبار سے جائز ہے) یہ خواہش بھی اس کی یا تو باقی نہ رہے گی یا بہت ضعیف ہوجائے گی۔

موجودہ صورت میں بزرگوں یا دوستوں کی مجلس میں اگر اہمیت نہیں ملتی اور اس پر احساس نازک ہوتا ہے تو یہ علامت ہے، اس بات کی کہ آپ راہ سلوک میں چل رہے ہیں اور نفس سخت پریشان کررہا ہے، نفس کی طرف سے پریشان کرنے کی کوششوں کے باوجود اس پر ردعمل ظاہر نہ کریں، یعنی دوستوں سے تعلقات خراب نہ کریں۔ اگر خالی احساس کی حد تک یہ جذبہ موجود ہے تو یہ قابل مواخذہ بات نہیں ہے۔ راہ سلوک میں چلتے رہنے کے نتیجہ میں اس طرح کے نفس کے سارے جذبات اندر سے نکلنے لگتے ہیں اور آئے دن یہ فاسد جذبات نکلتے رہتے ہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ ان شاء اللہ نفس مزکی ہوجائے گا۔ جس طرح زیر زمین پانی کھودنے کے لئے پہلے مٹی نکلتی ہے۔ پھر گاڑا نکلتا ہے۔ اس کے بعد مٹی آمیز پانی نکلتا ہے۔ آخر میں جاکر صاف پانی کا

چشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔ جو مستقلا جاری رہتا ہے۔

نظر کی حفاظت آج کے دور میں سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور بندہ مومن کے لئے بہت بڑی آزمائش ہے۔ جب تک نفس مطمئنہ ، شرح صدر اور قلب سلیم کا مقام حاصل نہیں ہوتا۔ تب تک اس طرح کے ہر موقعہ پر، نفس پر سخت جبر سے کام لینا پڑتا ہے، اس لئے کہ نظر اگر زیادہ دیر تک یا بار بار غیرمحرم عورت کی طرف اٹھتی رہی تو اس سے ذہن پراگندہ ہوتا ہے اور وہ جنسی خیالات کی طرف جاتا ہے۔ اور فرد کو یہ خیالات زیادہ دیر تک پریشان کرتے رہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک نظر (پہلی نظر) تو معاف ہے۔ لیکن دوسری بار دیکھنا گناہ ہے۔ دوسری حدیث شریف ہے کہ اگر تم نظروں کی حفاظت کرو ، اور دیکھنے کے مواقع ملنے کے باوجود نظر کو بچا لو تو تمہیں عبادت کی حقیقی حلاوت ولذت عطا کی جائے گی۔

اس لئے مبتدی اور متوسط طالب کو اس سلسلہ میں نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ آگے چل کر انشاء اللہ ذکر میں مداومت اور راہ محبت میں مسلسل چلتے رہنے کی برکت سے نظر کی حفاظت کی ازخود صورت پیدا ہوتی جائے گی۔ اللہ کے انوار حسن کی شعائیں طالب کو اس طرف دیکھنے ہی نہ دیں گی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

معاشی دوڑ میں دوسروں سے آگے نہ بڑھنے کا احساس ایسا ہے، جو جدید دور کا بڑا مرض ہے، جس میں تقریبا ہر عام وخاص فرد مبتلا ہے۔ سبب یہ ہے کہ مادی دنیا اس خوبصورتی کے ساتھ آئی ہے کہ فرد چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ وسائل ہوں، تاکہ زیادہ سے زیادہ سہولت کا سامان ہو ۔ اس میں حرص کا جذبہ بھی کام کرتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلی قومیں بڑھتے ہوئے حرص کی وجہ سے ہی تباہ ہوئی ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ کو جو نقصان پہنچا سکتے ہیں، حرص کا جذبہ فرد کے ایمان کو اس سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔

لیکن آپ کے بارے میں تو میرا تجربہ یہ ہے کہ آپ کے دل سے دنیا کی محبت بڑی حد تک نکل چکی ہے، آپ جس چیز کو حرص، دنیا کی محبت یا معاشی طور پر احساس کمتری سمجھ رہے ہیں، وہ اصل میں وقتی طور پر پیدا ہونے والے جذبات ہیں۔ کبھی

کبھار اس طرح کے جذبات کا پیدا ہونا، یہ بشری تقاضا ہے اور اس پر پریشان ہونا صحیح نہیں ہے۔

بچوں کے مستقل کی فکر ایک حد تک فطری ہے، لیکن جو شخص اللہ کے لئے خرچ کرتا ہے، اللہ اس کے گھر میں خیر وبرکت عطا فرماتا ہے، بچوں کی اصل فکر تو دائمی زندگی کی ہونی چاہئے۔ چند دن کی یہ زندگی تو کسی طرح گذر جائے گی، لیکن دائمی زندگی میں نجات کی صورت پیدا ہو ، یہ فکر غالب ہونی چاہئے۔ انشاء اللہ راہ سلوک میں چلتے رہنے کے نتیجہ میں یہ ساری چیزیں پیدا ہوتی جائیں گی۔

ایک یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ زیادہ دولت اپنے ساتھ زیادہ پریشانیاں لاتی ہے۔ مالدار لوگ جتنی پریشانیوں کا شکار ہیں، غریب افراد اس کا عشر وعشیر بھی نہیں۔ پھر زیادہ دولت سے بڑے پن کے داعیہ (جذبہ) کے طاقتور ہونے کا خطرہ لاگو رہتا ہے۔

آپ نے ہر مجلس میں شرکت سے طبیعت میں بیزاری کا ذکر بھی کیا ہے، یہ بیزاری متوسط طالب کی سب سے بڑی علامت ہے۔ متوسط طالب کی آرزو ہوتی ہے کہ کاش کہ وہ تنہا ہو یا اہل اللہ کی صحبت میں رہے۔ لوگوں سے اسے وحشت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اسلامی شریعت میں گوشہ نشینی اور ترک دنیا منع ہے، اس لئے جب تک نفس کا قابل ذکر حد تک تزکیہ نہیں ہوتا، تب تک یہ ساری باتیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ اور اذیت کے یہ تیر سہنے پڑیں گے۔ امام غزالیؒ دس سال تک بے تابی اور قبض کی اس حالت میں رہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۵ سال تک قبض اور سب سے بیزاری کی اس حالت میں رہے۔

جماعت سے نماز اس وقت تک سخت دشوار ہوگی، جب تک نفس جان نہیں چھوڑتا۔ جبر کرکے بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جبر کرنے سے نماز جماعت سے پڑھنے سے دگنا ثواب ہوگا۔ ایک نماز کا، دوسرا نفس پر جبر کرنے کا۔ قرآن میں ہے **وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ** نماز بھاری چیز ہے مگر جو خشیت اختیار کرنے والے ہیں یعنی اللہ سے ڈرنے والے ہیں ان کے لئے آسان ہے۔

آپ خوش نصیب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو راہ سلوک میں چلنے کی سعادت عطا فرمائی ہے، ورنہ یہ راہ اتنی دشوار ہے کہ لوگ درمیاں میں ہی بھاگ جاتے ہیں۔ خوش نصیبوں ہی کو اللہ تعالیٰ روزانہ نفس سے مقابلہ کرکے، اس راہ میں چلنے کی سعادت عطا فرماتے ہیں۔

ایک اہم بات جو لکھنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ انسان بشر ہے اور اس کے بشری تقاضے آخر وقت تک رہیں گے اجر وثواب اور درجات میں بلندی کا سارا تعلق اس بات سے ہے کہ فرد، مادی اور بشری رجحانات کے ہوتے ہوئے ان کا مقابلہ کرکے انہیں حداعتدال میں رکھے، بشری رجحانات اور تقاضوں سے تو فرشتے محفوظ ہیں، لیکن انسان شرف میں ان سے اس لئے بلند ہے کہ وہ بشری اور مادی تقاضوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت میں دیدیتا ہے اور نفس کو ضابطے میں رکھنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے یہ کوشش ہی اسے درجات میں بلندی اور جنت کا وارث بنانے کا ذریعہ ہے۔

خط کافی لمبا ہوگیا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۲ستمبر۲۰۱۳ء

عزیزم عبدالکریم گاندھی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

آپ کا ۲۹ آگست کا عنایت نامہ ملا۔

آپ اس بات پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے آپ کو اپنی محبت

کی سچی طلب عطا فرمائی ہے اور اپنی راہ میں چلنے کی سعادت بھی۔ بزرگوں کا بیان کردہ یہ نکتہ ہمارے لئے حوصلہ افزا ہے کہ دروازہ اس کے لئے کھلتا ہے، جو دروازہ کو کھٹکھٹاتا ہے۔

محبت ومعرفت کی راہیں بھی ان کے لئے ہی کھلتی ہیں، جو ان راہوں پر چلنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔

جو صاحبانِ دل عرصہ تک راہ عشق میں چل کر، فنا کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں، ان کی حالت آتش عشق میں جلنے والی ہوتی ہے، وہ سوزوساز، تپش اور حرارت سے لبریز ہوتے ہیں، ان کی صحبت سے ان کے دلوں سے یہ تپش اور حرارت از خود منتقل ہو کر دلوں میں داخل ہونے لگتی ہے۔

راہ عشق ومحبت میں اپنے مربی کی صحبت کو سارے بزرگوں نے فیصلہ کن اہمیت دی ہے، اس لئے کہ صحبت کی تاثیر سے سالک کے سفر میں آسانی ہوتی ہے اور اس کی کیفیات میں بہتری اور پاکیزگی ہونے لگتی ہے۔ لیکن چونکہ محبوب تک رسائی کی منزل بہت دشوار گذار ہے اور نفس کی رکاوٹیں بہت زیادہ ہیں، اس لئے تھکاوٹ کے احساس میں کمی کے لئے وقفہ وقفہ سے طالب کو صحبت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

عشق رسول یا اطاعت رسول یا تہجد وغیرہ کی سعادت کا حاصل ہونا، اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ طالب کے ذکر ومراقبہ کا دورانیہ کیا ہے؟ اگر سالک ایک گھنٹے سے ڈیڑھ گھنٹہ تک مراقبہ کا دورانیہ بڑھانے میں کامیاب ہے تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اسے بہت ساری سعادتیں حاصل ہوں گی، مثلاً نظر بد سے بچنے کی سعادت کا حاصل ہونا، سارے دن کی قلبی کیفیات میں بہتری کا ہونا، سکون وسکینت کا ہونا، اللہ پر یقین کی کیفیت کا مستحکم ہونا، اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لئے باعث خیر ثابت ہونا، دین کے لئے حمیت کا ہونا، دولت ودنیا کی محبت سے بلند ہوجانے کی سعادت کا حاصل ہونا، آخرت کی فکر کا غالب ہونا، رسول اللہ ﷺ کی ہر سنت پر عمل کرنے کے جذبہ کا ہونا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے ذکر کا نور طالب کو ان سعادتوں سے بہرہ ور کرنے کا ذریعہ

بنتا ہے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے سچی طلب کی دولت عطا فرمائی ہے، موجودہ دور میں یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ آپ کے مراقبہ کی راہ میں جو چیز حائل ہے یعنی باقائدگی سے ایک دیڑھ گھنٹے تک کے مراقبہ کی پابندی اس لئے نہیں ہوپاتی کہ آپ کا ذہن تھکا رہتا ہے نیند مکمل نہیں ہوتی، انسانی صحت کا اثر ذکر ومراقبہ پر بہت زیادہ پڑتا ہے، اس لئے بزرگوں نے لکھا ہے کہ دماغ اور معدہ کی صحت کی فکر کیا کرو، ورنہ کام سے رہ جاؤگے یعنی ذکر وعبادت یکسوئی سے نہ کرسکوؒ گے۔ محترم ڈاکٹر محمد طاہر صاحب کے علاج سے انشاء اللہ آپ کی صحت میں بہتری آئے گی۔ اب آپ سلوک میں میں اس مقام پر ہیں، جہاں آپ کے لئے گھنٹہ دیڑھ کا مراقبہ زیادہ مشکل نہیں، اب آپ آرام سے اتنا مراقبہ کرسکیں گے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

محبوب حقیقی کی اپنے چاہنے والوں سے جو ادائیں رہتی ہیں، وہ یہ ہیں کہ وہ انہیں کبھی خوف کی حالت میں رکھتا ہے تو کبھی رجا اور امید کی حالت ان پر غالب کردیتا ہے۔ کبھی انہیں خوشی ومسرت کے بے پناہ احساسات میں رکھتا ہے تو کبھی ان پر غم وحزن طاری کردیتا ہے۔ کبھی اپنی طرف کشش کے دروازے کھول دیتا ہے تو کبھی کوشش کے باوجود کیفیات کی بحالی کا عمل وانہیں ہوتا محبوب کی، اپنے محبوں کے ساتھ یہی ادائیں ہوتی ہیں۔

ذکر ومراقبہ کی گھنٹہ دیڑھ کی سعادت حاصل ہونے کے بعد طالب کا یہ مزاج بننا شروع ہوجاتا ہے کہ محبوب جس حالت میں بھی رکھے، وہ میرے لئے سعادت ہے، اسی میں میری بھلائی ہوگی اور میری مصلحت ہوگی۔ اسی کو رضا بالقضا کہتے ہیں۔ یعنی محبوب کی رضا پر راضی رہنا۔ ذکر کی سعادت حاصل ہونے کے بعد صبر وشکر کی نفسیات بھی غالب اور پختہ ہونے لگتی ہے۔

محبوب حقیقی کی شب وروز میں گھنٹہ دیڑھ گھنٹے کی معیت حاصل ہونے سے دل، ذہن اور نفسیات ومزاج میں پاکیزگی کے اجزاء غالب تر ہوتے جائیں گے۔ اس سے خوشی ومسرت کے بے پناہ احساسات حاصل ہوں گے۔

اللہ کا وعدہ ہے **وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ** جو ہمارے لئے مجاہدے کرتے ہیں، ہم ان کے لئے راہیں کھول دیتے ہیں۔ دوسری آیت ہے **وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ**. جو ہدایت پرگامزن ہیں ان کی ہدایت میں اضافہ کرتے ہیں اور انہیں تقویٰ عطا فرماتے ہیں۔ یعنی راہ ہدایت پر چلنے والے افراد کو اس بارے میں مطمئن ہونا چاہئے کہ محبوب حقیقی انہیں ترقی پر ترقی عطا فرماتا رہے گا اور انہیں ایک ہی مقام پر ہرگز نہیں چھوڑے گا۔

مولانا رومی نے فرمایا ہے کہ محبوب حقیقی اپنے محبّ سے ایک زندگی چھین کرکے، آخر میں اسے سونئی زندگیاں عطا فرماتا ہے یعنی ایک عرصہ تک ان کے دل کو دنیا سے اچاٹ کردیتا ہے، ان کے دل کو اپنے جلال وجمال سے زیر و زبر کردیتا ہے۔ جب وہ اپنی ساری توقعات اہل دنیا سے منقطع کرکے، محبوب حقیقی سے وابستہ کرلیتا ہے، نفس کو بڑی حدتک محبوب کے حوالے کردیتا ہے تو اس کے بعد وہ اس کے دل کو اپنی محبت ومعرفت سے بھردیتا ہے اور اسلامی احکامات اس کے لئے آسان کردیئے جاتے ہیں۔

اب مراقبہ کے سلسلہ میں آپ کی اہلیہ کے سوال سے متعلق کچھ باتیں پیش کی جاتی ہیں۔

ان کا اشکال غالبا مراقبہ کے لفظ پر زیادہ ہے، مراقبہ کے بجائے اگر ذکرخفی یا اسم ذات کا قلبی ذکر کہا جائے تو شاید ان کا اشکال ختم ہوجائے۔

مراقبہ، قوت وارتکاز کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اللہ کا ذکر ساری وجدانی وذہنی قوت وتوجہ کے ساتھ کیا جائے، اس طرح کیا جائے، جس سے باطنی قوتیں اور باطن میں موجود حسیں بیدار ہوجائیں۔ رسول اللہ ﷺ غار حرا میں اسم ذات کا قلبی ذکر ہی کرتے تھے، احادیث کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

ایک حدیث اس طرح بھی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا کہ بیٹا اللہ کا دھیان جماؤگے تو اللہ کو اپنے پاس موجود پاؤگے، ایک حدیث شریف میں قلبی ذکر کو جہری ذکر سے ستر گنا زیادہ افضل قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں کائنات کی کسی چیز میں نہیں سما سکتا سوائے بندہ

مؤمن کے دل میں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ کرام، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر گردن جھکا کر اس طرح بیٹھ جاتے تھے کہ اگر ان کے سروں پر پرندہ بیٹھ جائے تو وہ آسانی سے بیٹھ سکتا تھا۔

اس طرح کی احادیث اگر جمع کی جائیں تو مزید احادیث مل سکتی ہیں۔

احادیث کے علاوہ قرآن میں تو مراقبہ کا تاکیدی حکم فرمایا گیا ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے۔

ایک خاص نکتہ جسے سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ ایک عام فرد کو دین کے اہم معاملات میں اکابر بزرگوں اور بڑے بڑے علماء کرام کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے چلنا چاہئے۔ البتہ علمی مزاج کا حامل فرد اپنی ذہنی تشفی کے لئے سوالات کر سکتا ہے۔ اس طرح کے سوالات، معلومات میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ذہنی اطمینان کا باعث بھی بنتے ہیں۔

آپ کے گھر میں اللہ کے ذکر کا جو حلقہ شروع ہوا ہے، جسے کامیاب بنانے میں آپ کی اہلیہ کا کردار بھی شامل ہے، انشاء اللہ ذکر کے اس حلقہ کے اثرات آپ کی اہلیہ اور بچوں تک میں سرایت کریں گے۔ آہستہ آہستہ مزاج اور نفسیات کی تشکیل میں خیر کے اجزا غالب ہوتے جائیں گے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ دین ودنیا کی جملہ سعادتوں سے بہرہ ور فرمائے (آمین)

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو

۳۰ ستمبر ۲۰۱۳ء

برادرم عبدالکریم گاندھی صاحب

السلام علیکم : مزاج شریف

راہ محبت میں آپ کی بے چینی وبے تابی ایک اعتبار سے تو قابل رحم بات ہے، لیکن حقیقت میں یہ نفسی قوتوں کو آتش عشق میں جلانے کی ایک صورت ہے، چونکہ نفسی

قوتیں محبوب کے جلال کے تیروں اور انگاروں کے بغیر مضمحل نہیں ہوتی، اس لئے محبوب کی طرف سے محبت کے دعویداروں کو عرصہ تک قبض وبسط کے حالات میں رکھا جاتا ہے۔

طالب، محبوب کی اداؤں، عشق کے تقاضوں اور سلوک کے لوازمات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے شدید مضطرب ہوجاتا ہے، بلکہ اکثر ہلکر رہ جاتا ہے اور اس کی داخلی شخصیت زیر وزبر ہوجاتی ہے۔ طالب کے ساتھ روزمرہ زندگی میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔

طالب اگر محبوب کی اداؤں کا پوری طرح استحضار کرے اور سلوک کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا ادراک حاصل کرے تو اس کی تشویش اور بے تابی کی سنگینی اور زیر وزبر ہوتے رہنے کے احساسات میں کافی کمی آ سکتی ہے۔

حضرت خواجہ محمد معصومؒ کا قول ہے کہ تصوف نام ہی بے تابی کا ہے۔ تصوف سے اگر محبوب کے لئے بے تابی کو نکال دیا جائے تو تصوف نہیں رہتا۔

میں چونکہ دوران سلوک تقریبا بیس سال تک قبض، بے تابی اور محبوب کے جلال کے انگاروں کی حالت سے گذرا ہوں، اس لئے ہر سالک کو دورانِ سلوک پیش آنے والے یہ حالات میرے لئے نہ تو نئے ہیں اور نہ ہی حیرت انگیز، بلکہ اپنے تجربات کی وجہ سے میں اس طالب کو بہت بڑا خوش قسمت سمجھتا ہوں، جس پر تواتر کے ساتھ بے تابی کے حالات کا ورود ہوتا ہے، اس لئے کہ ایسے طالب کو محبوب، آگے چل کر بہت بڑی دولت عطا فرمانا چاہتا ہے۔ اس دولت کو سنبھالنے کی استعداد پیدا کرنے کے لئے اس کے دل کو اپنے علاوہ ہر چیز سے اچاٹ کردیتا ہے۔

محبوب کے جلال کے انگاروں پر لیٹنے والے طالب کو تسلی اور حوصلہ افزائی کی ضرورت لاحق ہے۔ میں اپنے تجربہ کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ آپ راہ سلوک میں بخیر خوبی چل رہے ہیں، تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کی ایمانی حالت بہتر سے بہتر ہورہی ہے، ہرآنے والا دن آپ کی روحانیت اور معرفت میں اضافہ کا ذریعہ بن رہا ہے، البتہ مبتدی ومتوسط طالب پر چونکہ تھکادینے والے سفر کے اثرات غالب رہتے ہیں اور اس کی کیفیات میں شدید ادل بدل رہتا ہے اور بعض اوقات بے صبری اس پر غالب ہوجاتی ہے، اس لئے اسے اپنے روحانی ارتقا اور محبت ومعرفت میں آگے بڑھنے

کا ادراک نہیں ہو پاتا۔ یہ ادراک نہ ہونے کی وجہ سے وہ غلط فہمی سے یہ رائے قائم کرلیتا ہے کہ وہ ایک ہی جگہ کھڑا ہے، اس کی ترقی رک گئی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ کسی کی محنت کو ضایع نہیں کرتا، راہ محبت میں چلنے والوں کے ساتھ تو وہ سراپا محبت بن جاتا ہے، لیکن محبوب کی محبت کے اسرارورموز نرالے ہیں۔ وہ اسرار ورموز یہ ہیں کہ طالب کے نفس کے اندر موجود بہت بڑے بت خانے کو ایک عرصہ تک اپنی جلالی تجلیات کے ذریعہ توڑے بغیر اپنی معرفت کا خزانہ عطا نہیں فرماتا۔ ایسا نفس، جو حرص وہوس، خودنمائی اور بڑے پن کے بتوں کا مرکز ہے، وہ اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ محبوب کے انوار حسن ہمہ وقت اس کے اندر موجود رہیں۔ اور دل محبوب کا مرکز بن جائے۔

آپ اس بات کو پوری طرح سمجھ لیں اور اس نکتہ کو دل کی گہرائیوں میں بٹھادیں کہ جب تک سلوک قابل ذکر حد تک طے نہیں ہوتا، تب تک حالت قبض وبسط کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہے گا، طالب کو ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرنا پڑے گا۔ ورنہ اضطراب اور بے تابی اسے مایوسی کی طرف لے جانے کا ذریعہ بن سکتی ہے، شیطان یہی چاہتا ہے کہ طالب کے دل اور ذہن پر خیالات اور وسوسوں کے ہجوم کو غالب کرکے اسے راہ محبت سے بھاگنے پر مجبور کیا جائے۔

راہ سلوک میں مبتدی ومتوسط طالب کو جن حالات سے واسطہ پڑتا ہے یا پڑسکتا ہے۔ ان میں کچھ چیزیں یہ ہیں۔ وسوسوں کا غالب ہونا، بعض حالات میں اپنے ایمان کو مشکوک سمجھنا، مردود سمجھنا، کبھی کبھار اشتعال اور غصہ کے اثرات کا غالب آنا اور ان اثرات کا دو دو تین تین دن تک موجود رہنا، روزانہ یا آئے دن بے چینی اور قبض کی حالت کا غالب ہونا، حالت قبض میں بہتری اور سلجھاؤ کے سارے راستوں کا مسدود ہونا، کبھی معمولی واقعہ سے ہی دل کے نظام کا درہم برہم ہونا اور کبھی پہاڑ جیسے مصائب کے باوجود خوشی ومسرت کے احساسات کا غالب ہونا، کبھی ذکر ومراقبہ اور عبادت میں غیرمعمولی حلاوت کا محسوس ہونا، کبھی ساری کوششوں کے باوجود محبوب کی طرف سے دروازوں کا وانہ ہونا، کبھی دوست واحباب اور عزیز واقارب کی بڑی بڑی زیادتیوں کے باوجود اس کا اثر نہ لینا، بلکہ ان کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعاؤں کا نکلنا اور کبھی

دوستوں کی معمولی باتوں سے بے حد مشتعل ہوجانا، کبھی معاشی تنگی اور گھر میں بیماری ہونے اور بظاہر ہر اعتبار سے نامساعد حالات کے باوجود تسکین قلب میں معمولی فرق بھی نہ ہونا اور کبھی اس طرح کی پریشانیوں کے موقعہ پر ازحد بے چین ہوجانا، کبھی بُرے بُرے وسوسوں کا غالب آنا اور تحت الشعور میں موجود ماضی کی بداعمالیوں کے واقعات کا ایک ایک کرکے ذہن میں مسلط ہونا اور کبھی پاکیزہ جذبات واحساسات سے قلب کا مسرور ہونا، کبھی نقصان پہنچانے والوں سے انتقام لینے کے خیالات کا گھیرے رہنا اور کبھی ایسے لوگوں کے پاس جاکر، ان سے دستہ بستہ معافی مانگنے کے احساسات کا غالب آنا۔

کبھی دنیا کی دہشت سے خوف زدہ ہونا اور مستقبل کی بے یقینی معاشی حالت سے مضطرب ہونا تو کبھی اس معاملہ میں اللہ پر یقین کی کیفیت کا غالب آنا، کبھی ذکر ومراقبہ کے لئے والہانہ پن پیدا ہونا، کبھی اس سلسلہ میں طبیعت کا نہ چاہنا، بعض اوقات اسلامی شریعت پر عمل کرنے میں سخت دشواری کا ہونا، بعض سالکوں میں اغوائے شیطانی سے اس احساس کا پیدا ہونا کہ وہ مردود ہے، اس کی اصلاح ممکن نہیں۔ غرض کہ راہ سلوک میں یہ اور اس طرح کے بہت سارے خطرات سالک کو درپیش ہوتے ہیں، لیکن جس سالک کو محبوب نے اپنے ذکر وفکر اور عبادت کی مستقل توفیق بخشی ہے اور جس کے لئے اپنی معرفت کا راستہ کھولا ہے، اسے یقین رکھنا چاہئے کہ محبوب نے اپنی وسیع تر حکمتوں ومصلحتوں کی خاطر مجھے اس امتحان میں ڈالا ہے، وہی ہے جو مجھے بخیر وخوبی اس امتحان سے گذار کر، نفس مطمئنہ کے اجزاء سے بہرہ ور فرمائے گا۔

بزرگوں نے یہ نکتہ لکھا ہے کہ طالب کو اپنے آپ کو مکمل طور پر اپنے مربی کے سپرد کرنا چاہئے، بالکل اس طرح، جس طرح مردہ غسال کے حوالے ہوتا ہے۔ مربی جو طویل عرصہ تک نفسی قوتوں کی وسیع تر دنیا طے کرچکا ہوتا ہے۔ اور جو راہ سلوک کے مدوجزر سے پوری طرح آشنا ہوتا ہے، طالب کو یقین رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے طویل تجربات ومشاہدات کی وجہ سے میرے ساتھ پیش آنے والے حالات کو مجھ سے زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے۔ ایسا کرنے سے طالب بہت ساری غیرضروری الجھنوں اور اور راہ سلوک سے فرار اختیار کرنے اور روزانہ کے مایوسی کے حملوں سے بڑی حد تک بچ جاتا

ہے۔

آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ آپ کا بنیادی ایمان ہی خطرہ میں ہے۔ آپ کو رسول اللہ ﷺ کی سنتوں سے تعلق خاطر ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے وسوسوں کو بنیاد بنا کر آپ بڑے نتائج نکال رہے ہیں۔ اس طرح کے وسوسوں کا مسلسل غالب ہونا، یہ دراصل اغوائے شیطانی کی صورت ہے، آپ اس سے نکلنے کی کوشش کریں۔

جس شخص کو اللہ نے اپنے ذکر ومراقبہ کی سعادت عطا فرمائی ہو، پانچوں وقت پابندی سے نماز کی توفیق دی ہو، روزانہ تلاوت قرآن کی نعمت عطا کی ہو۔ خدمت دین اور سب کے ساتھ بھلائی کی سعادت عطا کی ہو اور جس کے دل سے بڑی حد تک دنیا کی محبت نکال دی ہو ، وہ حالت ایمان سے نکل سکے، اس کا ایمان ہر وقت خطرہ میں ہو، یہ ایسی بات ہے، جو بالکل غلط ہے اور سراسر حقیقت کے خلاف ہے، آپ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں کہ اس نے آپ کو بہت ساری نیکیوں کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ کیا یہ سعادت کوئی کم سعادت ہے کہ آپ کے گھر پر اللہ کے ذکر کا مستقل حلقہ ہوتا ہے۔ جس میں کافی تعداد میں مرد وخواتین شریک ہوتے ہیں۔

میری ان باتوں پر یقین کریں۔ وسوسوں سے ہرگز پریشان نہ ہوں، شیطان جب دیکھے گا کہ یہ وسوسوں سے پریشان نہیں ہوتا تو وہ وسوسے ڈالنا چھوڑ دے گا۔

امید ہے کہ اس خط کو کافی سمجھیں گے۔

والسلام

احقر

محمد موسیٰ بھٹو